نظامِ ولایت فقیہ

عصرِ غیبت سے عصرِ ظہور تک

سید لیاقت علی کاظمی

بسم الله الرحمن الرحيم

نظام ولایت فقیہ

عصرِ غیبت سے عصرِ ظہور تک

تالیف: سید لیاقت علی کاظمی

عنوان کتاب: نظام ولایت فقیہ، عصر غیبت سے عصر ظہور تک

مؤلف: سید لیاقت علی کاظمی

نظر ثانی: ابو امثال

تاریخ: شنبہ، ۱۵ئ شوّال المکرم، ۱۴۴۷-۴/۴/۲۰۲۶

تعداد: ۱۰۰۰

نام ناشر:

فہرست

۱۔ حکومت، سیاست اور اسلام

۲/ اسلامی حکومت کے تاریخی نمونے (عہدِ معصومین علیہم السلام)

۳۔ نظریہ ولایتِ فقیہ کا تاریخی سفر

۴/ ولایتِ فقیہ؛ مفہوم، اقسام اور ماہیت

۵/ حکومت کی مشروعیت؛ الٰہی یا عوامی؟

ي / نظامِ ولایت فقیہ؛ عصر غیبت سے عصرِ ظہور تک

۷/ اسلامی نظام میں انتخابِ رہبر اور اہلِ حل و عقد (خبرگان)

۷ / ولایتِ فقیہ، آزادی اور انسانی حقوق

۸ر شبہات کا ازالہ اور سوالات (اعتراضات کا تجزیہ)

پیش لفظ

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي جَعَلَ وَلَايَةَ أَوْلِيَائِهِ أَمَانًا مِنْ كُلِّ هَلَكَةٍ، وَحِصْنًا مِنْ كُلِّ ضَلَالَةٍ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَىٰ سَيِّدِ الْكَائِنَاتِ، وَنُورِ الْأَرَضِينَ وَالسَّمَاوَاتِ، أَبِي الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ، وَعَلَىٰ آلِهِ الطَّيِّبِينَ الطَّاهِرِينَ، الَّذِينَ هُمْ أَرْكَانُ الْبِلَادِ، وَأَبْوَابُ الْإِيمَانِ، وَأُمَنَاءُ الرَّحْمٰنِ. وَنَشْهَدُ أَنَّ الْأَرْضَ لَا تَخْلُو مِنْ حُجَّةٍ لِلّٰهِ تَعَالَىٰ، وَفِي زَمَنِ غَيْبَةِ وَلِيِّهِ الْأَعْظَمِ (أَرْوَاحُنَا فِدَاهُ)، لَمْ يَتْرُكِ الْعِبَادَ سُدًى، بَلْ أَرْجَعَهُمْ إِلَىٰ الْفُقَهَاءِ الْعُدُولِ، اَلْجَامِعِينَ لِلشَّرَائِطِ، النُّوَّابِ الْعَامِّينَ لِلْإِمَامِ الْمُنْتَظَرِ (عَجَّلَ اللهُ فَرَجَهُ). فَهُمْ حُجَّةُ الْإِمَامِ عَلَيْنَا، وَالرَّادُّ عَلَيْهِمْ كَالرَّادِّ عَلَيْهِ. اَللّٰهُمَّ كُنْ لِوَلِيِّكَ الْحُجَّةِ بْنِ الْحَسَنِ، صَلَوَاتُكَ عَلَيْهِ وَعَلَىٰ آبَائِهِ، فِي هٰذِهِ السَّاعَةِ وَفِي كُلِّ سَاعَةٍ، وَلِيًّا وَحَافِظًا وَقَائِدًا وَنَاصِرًا. اَللّٰهُمَّ أَيِّدْ وَانْصُرْ مَنْ نَصَرَ الدِّينَ، وَاحْفَظْ ثَغْرَ الْإِسْلَامِ وَنِظَامَ الْوَلَايَةِ الْمُقَدَّسِ، اَلَّذِي هُوَ تَمْهِيدٌ لِظُهُورِ وَلِيِّكَ الْأَكْبَرِ، إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ.

اسلام محض چند رسومات، عبادات اور انفرادی اخلاقیات کے مجموعے کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ حیاتِ انسانی کے تمام انفرادی و اجتماعی گوشوں کے لیے ایک مکمل، ہمہ گیر اور ابدی "ضابطۂ حیات" ہے۔ خالقِ کائنات نے انسان کو تخلیق کر کے بے مہار نہیں چھوڑا، بلکہ اس کی ہدایت کے لیے نبوت اور امامت کا ایک نورانی

سلسلہ قائم کیا تاکہ زمین پر "قسط و عدل" کا قیام عمل میں آ سکے اور انسانیت "طاغوت" کی بندگی سے نکل کر "اللہ" کی بندگی کے سایۂ عاطفت میں پناہ لے سکے۔

عصرِ حاضر میں امتِ مسلمہ، بالخصوص مکتبِ تشیع کو جس سب سے بڑے فکری چیلنج کا سامنا ہے، وہ "دین اور سیاست کی جدائی" (Secularism) کا فتنہ ہے۔ استعماری طاقتوں نے صدیوں کی محنت سے مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ زہر گھولا ہے کہ "علماء کا کام صرف مصلے تک محدود ہے اور سیاست حکمرانوں کا کھیل ہے۔" اس فکری انحراف نے امت کو صدیوں تک جابر حکمرانوں اور سامراجی طاقتوں کا غلام بنائے رکھا۔

زیرِ نظر کتاب "نظامِ ولایتِ فقیہ" در حقیقت اسی تاریخی غلط فہمی کے ازالے اور اسلام کے سیاسی نظام کی بازیافت کی ایک علمی کوشش ہے۔ یہ کتاب محض جذباتی نعروں پر مبنی نہیں، بلکہ یہ "فقہِ استدلالی"، "کلامِ اسلامی" اور "سیاسی فلسفے" کے ٹھوس دلائل پر استوار ایک تحقیقی دستاویز ہے۔

اس کتاب کے صفحات میں ہم نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ "ولایتِ فقیہ" کوئی نوپید نظریہ یا بیسویں صدی کی اختراع نہیں ہے، بلکہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی "ریاستِ مدینہ" اور امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی "حکومتِ علوی" کا منطقی اور شرعی تسلسل ہے۔ غیبتِ کبریٰ کے طویل اور پر آشوب دور میں، جب امت کا رابطہ اپنے معصوم امام ارواحنا فداہ سے ظاہری طور پر منقطع ہے، عقل اور نقل (قرآن و سنت) دونوں اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے امت کو لاوارث نہیں چھوڑا۔ حکمتِ الٰہی کا تقاضا ہے کہ معصوم کی عدم موجودگی میں، معاشرے کی قیادت اس شخص کے سپرد ہو جو صفات (علم، تقویٰ، تدبیر) میں معصوم سے قریب تر ہو۔ اسی شخصیت کو فقہی اصطلاح میں "ولی فقیہ" کہا جاتا ہے۔

ہم نے ثابت کیا ہے کہ اسلامی حکومت "شخصی راج" نہیں بلکہ "قانونِ الٰہی کی حکمرانی" ہے۔ اس نظام میں ولی فقیہ کے پاس اختیارات کی وسعت (ولایتِ مطلقہ) اس کی ذات کے لیے نہیں، بلکہ امت کے مصالح

کے تحفظ اور شریعت کے نفاذ کے لیے ہے، اور وہ سخت ترین شرائط (علم و عدالت) کا پابند ہے۔

ہم نے واضح کیا ہے کہ اسلامی نظام میں "الٰہی مشروعیت" اور "عوامی مقبولیت" میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ ولایتِ فقیہ عوام کو "بھیڑ بکریاں" نہیں سمجھتی، بلکہ انہیں نظام کا محافظ اور نگران بناتی ہے۔ عوام کی بیعت اور حمایت کے بغیر اسلامی حکومت کا عملی قیام ناممکن ہے۔

امید کرتا ہوں کہ یہ کاوش اہلِ علم، طلباء اور حقیقت کے متلاشی نوجوانوں کے لیے ایک مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔ یہ کتاب ان شکوک و شبہات کے تاریک بادلوں کو چھانٹنے میں مدد دے گی جو لبرل ازم اور سیکولر ازم کی یلغار نے پیدا کیے ہیں۔

آخر میں، بارگاہِ رب العزت میں دعا ہے کہ وہ ہماری اس حقیر کاوش کو قبول فرمائے اور اسے ولی عصر، امامِ زمانہ (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) کے ظہورِ پر نور کے لیے زمینہ ساز بنائے۔

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

سید لیاقت علی کاظمی

باب اول: حکومت، سیاست اور اسلام

عصرِ حاضر میں امتِ مسلمہ جس فکری انتشار اور سیاسی زوال کا شکار ہے، اس کی بنیادی وجہ وہ خلا ہے جو 'قیادتِ الٰہیہ' کے فقدان سے پیدا ہوا ہے۔ دنیا بھر میں مروج سیاسی نظاموں نے انسان کو مادی ترقی کے نام پر ضمیر کی آزادی سے محروم کر دیا ہے، جبکہ دوسری طرف اسلامی معاشروں میں استعمار کے گہرے اثرات نے دین کو سیاست سے جدا کر کے اسے محض چند انفرادی عبادات تک محدود کر دیا ہے۔

زیرِ نظر کتاب اسی فکری جمود کو توڑنے کی ایک علمی کوشش ہے۔ اس کتاب کا مقصد اردو زبان کے قارئین، بالخصوص برصغیر کے اہل دانش کو اس عظیم سیاسی نظریے سے روشناس کروانا ہے جو محض ایک خشک فقہی بحث نہیں، بلکہ دورِ غیبت میں اسلام کے سماجی اور سیاسی نفاذ کا واحد منطقی راستہ ہے۔ یہ کتاب ثابت کرے گی کہ 'ولایتِ فقیہ' عادلانہ نظامِ حکومت کا وہ سنگِ میل ہے جو انسانیت کو طاغوتی قوتوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی حاکمیت کے سائے میں لاتا ہے۔

ولایتِ فقیہ کا لغوی و اصطلاحی مفہوم

کسی بھی علمی نظریے کو سمجھنے کے لیے اس کے اجزائے ترکیبی کی تفہیم ضروری ہے۔ 'ولایتِ فقیہ' دو کلیدی اصطلاحات کا مجموعہ ہے جن کی جڑیں قرآن و سنت، سیرت و فرامین اہل بیت علیہم السّلام اور عقلِ سلیم میں پیوست ہیں۔ لسانی اعتبار سے 'ولایت' کا مادہ 'و ل ی' ہے، جس کے معنی دو چیزوں کے درمیان اس قدر قربت کے ہیں کہ ان کے درمیان کوئی تیسری چیز حائل نہ رہے۔ معروف ماہرِ لغت راغب اصفہانی کے

مطابق، یہ کلمہ قربِ مکانی اور معنوی دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے[۱]۔

علمِ سیاسیات اور فقہ کی اصطلاح میں 'ولایت' سے مراد "تدبیرِ امور کی باگ ڈور سنبھالنا" اور "صاحبِ اختیار ہونا" ہے۔ یہ محض ایک رسمی عہدہ نہیں بلکہ ایک ایسا قلبی اور قانونی تعلق ہے جس میں ولی (سرپرست) اپنے مولیٰ علیہ (جس کی سرپرستی کی جارہی ہو) کے مفادات کا تحفظ کرتا ہے۔ شہید مطہریؒ اس نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ولایت کا اصل جوہر 'قرب' ہے، یعنی حاکم اور عوام کے درمیان کوئی بیگانگی نہیں بلکہ ایک ایسا نامیاتی تعلق ہے جس میں حاکم، عوام کی روحانی اور مادی فلاح کا ذمہ دار ہوتا ہے[۲]۔

لفظ 'فقیہ' کی حقیقت

لغت میں 'فقیہ' کے معنی 'مردِ عالم' کے ہیں[۳]۔ لیکن اصطلاحی طور پر فقیہ اس مجتہد کو کہتے ہیں جو شریعت کے اصولوں، احکام اور مجموعی مقاصد پر مکمل دسترس رکھتا ہو۔

ایک فقیہ صرف وہ نہیں جس نے چند کتابیں پڑھ رکھی ہوں، بلکہ اس کے اندر "ملکۂ اجتہاد" کا ہونا ضروری ہے۔ ملکۂ اجتہاد سے مراد وہ فکری پختگی اور علمی صلاحیت ہے جس کے ذریعے ایک عالم، بدلے ہوئے حالات اور نئے مسائل کا حل کتاب و سنت کے بنیادی قواعد سے استنباط کر سکے[۴]۔ ولایتِ فقیہ کا حامل ایک ایسا 'ماہرِ دین' ہوتا ہے جو ایمان، عدالت اور بصیرت کے اس درجے پر ہو کہ وہ فروعی مسائل کو کلی

---

[۱] منصور نژاد، دین و دولت در اسلام، جلد ۱، صفحہ ۴۴۔

[۲] میر احمدی، آشنایی با اندیشہ سیاسی شہید مطہری، جلد ۱، صفحہ ۵۳۔

[۳] طباطبایی یزدی، درآمدی بر فقہ حکومتی و مدیریتی، جلد ۱، صفحہ ۱۳۔

[۴] جلالی زادہ، مبادیٔ و اصطلاحات اُصول الفقہ، جلد ۱، صفحہ ۲۳۴۔

قواعد کی روشنی میں حل کرنے کی قدرت رکھتا ہو[۱]۔

ولایتِ فقیہ کی جامع تعریف

فقہِ سیاسی میں ولایتِ فقیہ سے مراد یہ ہے کہ: "امامِ زمانہ ارواحنا فداہ کی غیبت کے دوران، معاشرے کے امور کی سربراہی ان فقہا کے سپرد ہو جو کتاب و سنت پر عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ عقل، علم، عدالت، شجاعت اور زمان شناسی (Political Awareness) جیسی شرائط پر پورا اترتے ہوں"[۲]۔

یہاں دو مکاتبِ فکر پائے جاتے ہیں:

- ولایتِ مطلقہ فقیہ: اس سے مراد یہ ہے کہ ولی فقیہ کے اختیارات تدبیرِ امور اور نظمِ مملکت میں وہی ہیں جو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ معصومین علیہم السلام کے تھے، تاکہ وہ اسلام کے وسیع تر مفاد میں معاشرے کی صحیح سمت میں رہنمائی کر سکے[۳]۔
- ولایتِ محدودہ: بعض فقہا کے نزدیک فقیہ کا دائرۂ اختیار محض فتویٰ، قضا (عدالت) اور امورِ حسبیہ (ایسے کام جن کا کوئی وارث نہ ہو) تک محدود ہے۔

اسلام اور سیاست کا باہمی ربط

جدید دور کا سب سے بڑا فتنہ 'سیکولرازم' یا دین کی سیاست سے علیحدگی ہے۔ اسلام اس نظریے کی مکمل نفی کرتا ہے، کیونکہ اسلام محض ایک مذہب نہیں بلکہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔

---

[۱] مروج، حسین، اصطلاحات فقہی، جلد ا، صفحہ ۳۸۷۔

[۲] مرادی، واژہ نامہ فقہ سیاسی، جلد ا، صفحہ ۱۸۳۔

[۳] مرادی، واژہ نامہ فقہ سیاسی، جلد ا، صفحہ ۱۸۳۔

قرآنِ کریم نے اقتدار اور حاکمیت کو براہِ راست اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جوڑا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿النَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ﴾[1] "یہ نبی مومنوں پر ان کی جانوں سے زیادہ حقِ تصرف رکھتا ہے"۔

امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ یہ آیت براہِ راست امارت اور حکومت کے بارے میں نازل ہوئی ہے[2]۔ اسی طرح سورہ حدید کی آیت ۲۵ میں انبیاء کی بعثت کا مقصد "قیامِ قسط" (عدل کا قیام) بتایا گیا ہے، جو بغیر سیاسی طاقت اور حکومت کے ناممکن ہے۔

سیرتِ معصومین علیہم السلام بطورِ سیاسی نمونہ

تاریخِ اسلام گواہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ میں باقاعدہ ریاست قائم کی، گورنر مقرر کیے اور معاہدے کیے۔ اگر سیاست دین سے جدا ہوتی تو آپؐ کبھی ریاست تشکیل نہ دیتے۔ یہی سیرت مولا علی علیہ السلام کی ہے، جنہوں نے اپنے دورِ خلافت میں ایک وسیع انتظامی ڈھانچہ تشکیل دیا[3]۔ شہید مطہریؒ کے بقول، اسلام کے جسم پر سب سے بڑا زخم اس دن لگا جب سیاست کو دیانت سے الگ کر دیا گیا[4]۔

اسلامی احکام کی سماجی جہتیں

اگر ہم فقہ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے بیشتر احکام اجتماعی نوعیت کے ہیں:

- مالیاتی نظام: خمس اور زکوٰۃ محض صدقہ نہیں بلکہ ایک ریاست کے معاشی استحکام اور طبقاتی فرق

---

[1] احزاب:۶۔

[2] شاکرین، دین و سیاست، ولایت فقیہ، جلد ۱، صفحہ ۲۶۔

[3] فوزی، اندیشہ سیاسی امام خمینی (رہ)، جلد ۱، صفحہ ۱۰۳۔

[4] توسلی، دین؛ دریای سیاست، جلد ۱، صفحہ ۴۰۔

مٹانے کے ذرائع ہیں[۱]۔

- دفاعی نظام (جہاد): قرآن حکم دیتا ہے کہ دشمن کے مقابلے کے لیے اپنی قوت (Power) تیار رکھو[۲]۔ یہ دفاعی تیاری بغیر منظم حکومت کے ممکن نہیں۔
- عدالتی نظام (حدود و تعزیرات): چور کا ہاتھ کاٹنا یا قصاص لینا کسی فرد کا کام نہیں بلکہ یہ ریاست کی ذمہ داری ہے[۳]۔

امام خمینیؒ فرماتے ہیں کہ فقہ کی پچاس سے زائد کتب میں سے بمشکل سات یا آٹھ عبادات سے متعلق ہیں، باقی تمام کا تعلق سیاست، اجتماع اور معاشرت سے ہے[۴]۔

دورِ غیبت میں حکومت کی ضرورت

ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا امامِ معصوم کی غیبت کے دوران اسلامی احکام کی معطل ہیں؟

اسلام ایک ابدی دین ہے جس کے احکام قیامت تک کے لیے ہیں۔ اگر یہ احکام دائمی ہیں، تو ان کا 'نفاذ' بھی دائمی ہونا چاہیے۔ امام خمینیؒ کے بقول، یہ کہنا کہ غیبت میں احکام معطل رہیں گے، گویا یہ کہنا ہے کہ اسلام ایک محدود مدت کا دین تھا[۵]۔ عقل کا تقاضا ہے کہ جب تک معاشرہ موجود ہے، اسے قانون اور اس قانون کو نافذ کرنے والے کی ضرورت رہے گی۔

---

[۱] رضایی، قرآن و تربیت، جلد ۵، صفحہ ۲۴۵۔

[۲] انفال: ۶۰۔

[۳] دہقان، راہ زندگی، جلد ۱، صفحہ ۳۴۲۔

[۴] شاکرین، دین و سیاست، جلد ۱، صفحہ ۲۵۔

[۵] فوزی، اندیشہ سیاسی امام خمینی (رہ)، جلد ۱، صفحہ ۱۰۴۔

معاشرے میں انسانوں کے مفادات کا ٹکراؤ ناگزیر ہے۔ اگر کوئی حاکم اور قانون نہ ہو، تو طاقتور کمزور کو کھا جائے گا اور انسانی معاشرہ جنگل کا نقشہ پیش کرے گا۔ عقلِ سلیم یہ فیصلہ دیتی ہے کہ نظم و ضبط کے قیام کے لیے ایک ایسی اتھارٹی ہونی چاہیے جو الٰہی قوانین کی روشنی میں فیصلے کرے۔ دورِ غیبت میں یہ قرعۂ فال 'فقیہِ عادل' کے نام نکلتا ہے جو نہ صرف قانون کو جانتا ہے بلکہ اپنی عدالت کی وجہ سے اس کے غلط استعمال سے بھی بچتا ہے[1]۔

ادلّۂ اثباتِ ولایتِ فقیہ

اس حصے میں ہم ان علمی ستونوں کا جائزہ لیں گے جن پر ولایتِ فقیہ کی عظیم الشان عمارت کھڑی ہے۔ یہ دلائل دو حصوں میں منقسم ہیں: برہانِ عقلی اور ادلۂ نقلی۔

ا: دلیلِ عقلی

عقلِ سلیم انسانی فطرت کا وہ نور ہے جو وحی کے پیغامات کو سمجھنے اور ان کے نفاذ کی ضرورت کو تسلیم کرنے میں مدد دیتا ہے۔ ولایتِ فقیہ کے حق میں بنیادی عقلی استدلال درج ذیل مقدمات پر مبنی ہے:

انسانی زندگی اجتماعی ہے اور اجتماعیت کا لازمہ نظم و ضبط ہے۔ اگر کسی معاشرے میں قانون اور اسے نافذ کرنے والی قوت نہ ہو، تو انسانی میلانات، خود غرضی اور مفادات کا ٹکراؤ اسے ہرج و مرج کی بھینٹ چڑھا دے گا، جس کے نتیجے میں جان، مال اور عزت و آبرو خطرے میں پڑ جائے گی[2]۔

امام خمینیؒ اس عقلی ضرورت پر زور دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حکومت کا قیام محض ایک سیاسی عمل نہیں بلکہ سماجی بقا کے لیے ایک منطقی ضرورت ہے۔ اگر قانونِ الٰہی موجود ہو لیکن اسے نافذ کرنے والا نہ ہو، تو وہ

---

[1] فوزی، اندیشہ سیاسی امام خمینی (رہ)، جلد ۱، صفحہ ۱۰۵۔

[2] نظر پور، آشنایی با نظام جمہوری اسلامی ایران، جلد ۱، صفحہ ۱۵۔

قانون محض کتابی حروف بن کر رہ جائے گا[۱]۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ حکومت ضروری ہے، تو عقل سوال کرتی ہے کہ "حاکم کون ہو؟"۔ چونکہ ہم ایک اسلامی معاشرے کی بات کر رہے ہیں جہاں حاکمیتِ مطلقہ صرف اللہ کی ہے، اس لیے وہاں حاکم وہی ہو سکتا ہے جو:

- قانونِ الٰہی کا عالم ہو (فقیہ): جس نظام میں قانون 'خدا' کا ہو، وہاں اس قانون کا ماہر ہی زمامِ اقتدار سنبھالنے کا سب سے زیادہ حقدار ہے۔
- پاکیزگیٔ کردار (عادل): اگر حاکم عالم تو ہو لیکن عادل نہ ہو، تو وہ علم کو ذاتی مفادات کے لیے استعمال کر کے بدترین آمریت قائم کر سکتا ہے۔
- انتظامی صلاحیت کا حامل ہو (مدبر): محض علم اور تقویٰ کافی نہیں، بلکہ سیاسی بصیرت اور معاشرے کو چلانے کی عملی قوت بھی ضروری ہے[۲]۔

نتیجتاً عقل یہ فیصلہ سناتی ہے کہ معصوم کی غیبت کے دور میں "فقیہِ عادل و مدبر" ہی وہ بہترین انتخاب ہے جو معاشرے کو الٰہی مقاصد کی طرف لے جا سکتا ہے۔

۲: دلائلِ نقلی (آیات و روایات)

نقلی دلائل سے مراد وہ قطعی شواہد ہیں جو قرآنِ مجید اور احادیثِ معصومین علیہم السلام سے اخذ کیے گئے ہیں۔

الف) آیاتِ قرآن

[۱] فوزی، اندیشہ سیاسی امام خمینی (رہ)، جلد ۱، صفحہ ۱۰۵۔
[۲] فوزی، اندیشہ سیاسی امام خمینی (رہ)، جلد ۱، صفحہ ۱۰۶۔

قرآنِ کریم میں حاکمیت اور اطاعت کے حوالے سے متعدّد مقامات پر ولایتِ فقیہ کے اصول ملتے ہیں:

ا۔ اطاعتِ اولی الامر:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَ أَطِيعُوا الرَّسُولَ وَ أُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ﴾[۱] "اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور تم میں سے جو صاحبانِ امر ہیں ان کی بھی"۔

امام خمینیؒ اس آیت کی روشنی میں استدلال فرماتے ہیں کہ 'اولی الامر' سے مراد وہ ہستیاں ہیں جن کے ہاتھ میں معاشرے کے امور کی باگ ڈور ہو۔ معصومین علیہم السّلام کے بعد، یہ منصب ان فقہا کی طرف منتقل ہوتا ہے جو ان کے بتائے ہوئے معیار پر پورا اترتے ہیں[۲]۔

۲۔ نفیِ طاغوت اور حاکمیتِ الٰہی:

قرآن ان لوگوں کی مذمت کرتا ہے جو اللہ کے نازل کردہ قانون کے بجائے 'طاغوت' (غیر الٰہی طاقتوں) کے پاس اپنے فیصلے لے جاتے ہیں[۳]۔ چونکہ غیبت کے دور میں بھی طاغوت کی پیروی حرام ہے، اس لیے ضروری ہے کہ ایک 'ولیِ شرعی' موجود ہو جس کی طرف رجوع کر کے انسان طاغوتی نظام کی غلامی سے بچ سکے۔

ب) روایاتِ معصومین علیہم السّلام

احادیثِ مبارکہ میں صراحت کے ساتھ فقہا کو انبیاء کا وارث اور ان کا قائم مقام قرار دیا گیا ہے:

---

[۱] نساء/۵۹۔

[۲] فوزی، اندیشہ سیاسی امام خمینی (رہ)، جلد ۱، صفحہ ۱۰۴۔

[۳] نساء/۶۰۔

۱۔ مقبولۂ عمر بن حنظلہ:

امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس مشہور روایت میں واشگاف الفاظ میں فرمایا کہ جو شخص ہمارے احکام کو جانتا ہو اور حلال و حرام کی تمیز رکھتا ہو، اسے میں نے تمہارے لیے "حاکم" مقرر کر دیا ہے[۱]۔ یہاں 'حاکم' کا لفظ صرف قاضی کے لیے نہیں بلکہ وسیع تر سیاسی اختیارات کے لیے استعمال ہوا ہے۔

۲۔ توقیعِ شریف (امامِ زمانہ ارواحنا فداہ کا فرمان):

امامِ عصر ارواحنا فداہ نے اسحاق بن یعقوب کے نام اپنے خط میں تحریر فرمایا: "وَ أَمَّا اَلْحَوَادِثُ اَلْوَاقِعَةُ فَارْجِعُوا فِيهَا إِلَىٰ رُوَاةِ حَدِيثِنَا فَإِنَّهُمْ حُجَّتِي عَلَيْكُمْ وَ أَنَا حُجَّةُ اَللّٰهِ عَلَيْهِمْ" " اور جو نئے حادثات اور مسائل پیش آئیں، ان میں ہماری احادیث کے راویوں (فقہا) کی طرف رجوع کرو، کیونکہ وہ تم پر میری حجت ہیں اور میں ان پر اللہ کی حجت ہوں"[۲]۔

اس حدیث میں "حوادثِ واقعہ" سے مراد صرف فقہی مسائل نہیں بلکہ معاشرے کو درپیش سیاسی، سماجی اور انتظامی چیلنجز ہیں، جن میں فقہا کی رہنمائی کو 'حجت' قرار دیا گیا ہے۔

عقلی اور نقلی دلائل کا یہ سنگم ثابت کرتا ہے کہ ولایتِ فقیہ کوئی نیا یا مصنوعی نظریہ نہیں ہے، بلکہ یہ اسلام کے سیاسی ڈھانچے کا وہ ناگزیر حصہ ہے جو امت کو دورِ غیبت میں بے لگام ہونے سے بچاتا ہے۔ یہ نظام اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ معاشرے کی باگ ڈور کسی جاہل یا ظالم کے ہاتھ میں جانے کے بجائے ایک ایسے صاحبِ علم انسان کے پاس رہے جو اللہ کے حضور جوابدہ ہو۔

---

[۱] فوزی، اندیشہ سیاسی امام خمینی (رہ)، جلد ۱، صفحہ ۱۰۷۔
[۲] فوزی، اندیشہ سیاسی امام خمینی (رہ)، جلد ۱، صفحہ ۱۰۷۔

ولایت فقیہ کا ارتقائی سفر

اکثر معترضین یہ پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ ولایتِ فقیہ کا نظریہ چودھویں صدی ہجری کی پیداوار ہے، حالانکہ تاریخِ فقہ کا عمیق مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ غیبتِ صغریٰ کے خاتمے سے ہی فقہائے عظام نے اس منصب کی ذمہ داریوں کو محسوس کر لیا تھا۔

ولایتِ فقیہ علمائے سلف کے کلام میں

قدیم فقہاء نے اگرچہ "ولایتِ فقیہ" کی اصطلاح اس موجودہ سیاسی قالب میں استعمال نہیں کی تھی، مگر اس کے جوہر اور اختیارات پر ان کا اتفاقِ رائے موجود تھا۔

۱۔ شیخ مفید (متوفی ۴۱۳ھ): بنیاد گزارِ فکر

شیخ مفیدؒ وہ پہلے عظیم فقیہ ہیں جنہوں نے غیبتِ کبریٰ کے ابتدائی دور میں ہی فقہاء کی سیاسی و سماجی ذمہ داریوں کا تعین کیا۔ آپ اپنی معرکہ آراء کتاب "المقنعہ" میں تحریر فرماتے ہیں کہ اگر امامِ معصوم علیہ السلام پردۂ غیبت میں ہوں، تو فقہائے شیعہ مسلمانوں کے امور کے ذمہ دار ہیں[1]۔

شیخ مفیدؒ کا تجزیہ یہ تھا کہ احکامِ الٰہی کی معطلی معاشرے کو تباہ کر دے گی، لہٰذا فقہاء ہی امام علیہ السلام کے حقیقی نائب اور امین ہیں۔

۲۔ محقق کرکی (متوفی ۹۴۰ھ): ولایتِ عامہ کا تصور

دورِ صفویہ کے عظیم فقیہ محقق کرکیؒ نے ولایتِ فقیہ کو ایک منظم انتظامی شکل دی۔ انہوں نے صراحت کی کہ فقیہِ جامع الشرائط کو "ولایتِ عامہ" حاصل ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام سیاسی اور سماجی

---

[1] فوزی، اندیشہ سیاسی امام خمینی (رہ)، جلد ۱، صفحہ ۱۰۸۔

معاملات جن کا تعلق نظمِ عامہ سے ہے، فقیہ کے دائرہ اختیار میں آتے ہیں[۱]۔

۳۔ علامہ نراقی (متوفی ۱۲۴۵ھ): نظریاتی پختگی

ولایتِ فقیہ کی بحث میں علامہ نراقیؒ کی کتاب "عوائد الایام" ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ انہوں نے اس نظریے کو "ضروریاتِ مذہب" میں سے قرار دیا اور یہ استدلال پیش کیا کہ فقیہ کو وہ تمام اختیارات حاصل ہیں جو امامِ معصوم علیہ السلام (ع) کو حاصل تھے، سوائے ان مخصوص امور کے جن کے لیے معصوم علیہ السلام کی تخصیص پر کوئی خاص دلیل موجود ہو[۲]۔

۴۔ صاحبِ جواہر (متوفی ۱۲۶۶ھ): فقہی اجماع

شیخ محمد حسن نجفیؒ، جنہوں نے فقہِ شیعہ کا عظیم انسائیکلوپیڈیا "جواہر الکلام" تالیف کیا، ولایتِ فقیہ کے اتنے قائل تھے کہ انہوں نے فرمایا: "جو شخص ولایتِ فقیہ کے بارے میں شک کرتا ہے، گویا اس نے فقہ کا ذائقہ ہی نہیں چکھا"[۳]۔

ولایتِ فقیہ میدانِ عمل میں

ولایتِ فقیہ صرف کتابوں کی زینت نہیں رہی، بلکہ تاریخِ عالم نے کئی بار فقیہ کے ایک قلمی اشارے سے تخت و تاج کو الٹتے دیکھا ہے۔

۱۔ تحریکِ تمباکو اور میرزائے شیرازی (۱۸۹۱ء)

[۱] فوزی، اندیشہ سیاسی امام خمینی (رہ)، جلد ا، صفحہ ۱۰۸۔
[۲] فوزی، اندیشہ سیاسی امام خمینی (رہ)، جلد ا، صفحہ ۱۰۹۔
[۳] فوزی، اندیشہ سیاسی امام خمینی (رہ)، جلد ا، صفحہ ۱۰۹۔

برطانوی استعمار کے خلاف مرجعِ وقت میرزائے شیرازیؒ کا ایک جملہ ولایتِ فقیہ کی عملی طاقت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ جب انہوں نے فتویٰ دیا: "اَلْیَوْمَ اِسْتِعْمَالُ اَلتُّنْبَاکُو وَ تِبَاعُهُ بِأَیِّ وَجْهٍ کَانَ، مُحَارِبَةٌ مَعَ اَلْإِمَامِ اَلْعَصْرِ عَجَّلَ اَللّٰهُ فَرَجَهُ"[1]۔ "آج کے دن تمباکو کا استعمال اور اس کی خرید و فروخت کسی بھی صورت میں ہو، امامِ زمانہ ارواحنافداہ کے خلاف اعلانِ جنگ ہے"۔

اس فتوے نے شاہی محلات سے لے کر عام گلیوں تک تمباکو کے استعمال کو ختم کر دیا اور برطانیہ کو ذلت آمیز پسپائی اختیار کرنی پڑی۔ یہ محض ایک فتویٰ نہیں تھا، بلکہ ایک سیاسی فرمان تھا۔

۲۔ عراق میں برطانوی تسلط کے خلاف جہاد (۱۹۱۴ء)

جب برٹانیا نے عراق پر حملہ کیا، تو نجف کے مراجع بشمول آیت اللہ سید محمد کاظم یزدیؒ اور میرزا محمد تقی شیرازیؒ نے جہاد کا فتویٰ صادر کر کے یہ ثابت کر دیا کہ فقیہ صرف مدرسے کا استاد نہیں بلکہ سرحدوں کا محافظ بھی ہے[2]۔

امام خمینیؒ اور ولایتِ فقیہ کا احیاء

حضرت امام خمینیؒ وہ شخصیت ہیں جنہوں نے اس نظریے کو "حجرۂ تحقیق" سے نکال کر "میدانِ عمل" میں برپا کر دیا۔ امام خمینیؒ نے اس نظریے کو 'فرد' سے نکال کر 'نظام' کی صورت دی۔ ۱۹۶۹ء میں نجفِ اشرف کے علمی ماحول میں آپ نے اس موضوع پر تفصیلی دروس دیے، جو بعد ازاں کتابی صورت میں "ولایتِ فقیہ" کے نام سے شائع ہوئے[3]۔ جو پوری دنیا میں "سیاسی اسلام" کا منشور بن گئے۔ انہوں نے ثابت

---

[1] فوزی، اندیشہ سیاسی امام خمینی (رہ)، جلد ۱، صفحہ ۱۱۰۔

[2] فوزی، اندیشہ سیاسی امام خمینی (رہ)، جلد ۱، صفحہ ۱۱۰۔

[3] فوزی، اندیشہ سیاسی امام خمینی (رہ)، جلد ۱، صفحہ ۱۱۲۔

کیا کہ اسلام میں "حکومت" محض ایک انتظامی ضرورت نہیں بلکہ یہ احکامِ الٰہی کے نفاذ کا بنیادی ذریعہ ہے [۱]۔ ۱۹۷۹ء میں انقلاب کی کامیابی کے بعد، اس نظریے کو آئینی تحفظ فراہم کیا گیا۔ ایران کے دستور کی 'دفعہ ۵' کے مطابق، دورِ غیبت میں امت کی امامت و قیادت ایک ایسے فقیہِ عادل کے سپرد ہے جو شجاع، مدبر اور زمان شناس ہو [۲]۔

۱۹۷۹ء کا اسلامی انقلاب اسی نظریے کا عملی ثمر تھا۔ امامؒ نے دنیا کو ایک ایسا نظامِ حکومت دیا جہاں 'عوام کی رائے' اور 'خدا کے قانون' کے درمیان ایک خوبصورت توازن موجود ہے۔

امام خمینیؒ کے نزدیک اس نظام کے قیام کا مقصد محض اقتدار نہیں تھا، بلکہ درج ذیل اہداف کا حصول تھا:

- استقلالِ سیاسی و اقتصادی: عالمی طاقتوں کی غلامی سے نجات۔
- حمایتِ مستضعفین: دنیا بھر کے مظلوموں کی آواز بننا۔
- مبارزہ با استکبار: باطل اور استعماری قوتوں کے سامنے سینہ سپر ہونا [۳]۔

ولایتِ فقیہ کا تاریخی سفر اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ یہ نظریہ علمائے سلف کی علمی امانت تھی جسے امام خمینیؒ نے ایک عالمی نظام کی صورت میں ڈھال دیا۔ یہ نظام ثابت کرتا ہے کہ اسلام میں قیادت کا معیار محض موروثیت یا مادی قوت نہیں، بلکہ علم، تقویٰ اور بصیرت ہے۔

---

[۱] فوزی، اندیشہ سیاسی امام خمینی (رہ)، جلد ا، صفحہ ۱۱۲۔
[۲] فوزی، اندیشہ سیاسی امام خمینی (رہ)، جلد ا، صفحہ ۱۱۲۔
[۳] فوزی، اندیشہ سیاسی امام خمینی (رہ)، جلد ا، صفحہ ۱۱۳۔

ولی فقیہ کی شرائط اور دائرۂ اختیار

ولایتِ فقیہ کا منصب کوئی موروثی یا اتفاقی عہدہ نہیں، بلکہ یہ سخت ترین علمی اور اخلاقی شرائط سے مشروط ہے:

۱۔ علم (اجتہادِ مطلق): حاکم کے لیے ضروری ہے کہ وہ 'مجتہدِ جامع الشرائط' ہو، یعنی اس کے اندر وہ ملکہ موجود ہو جس سے وہ ادلۂ تفصیلیہ (قرآن، سنت، عقل، اجماع) سے احکام اخذ کر سکے[۱]۔

۲۔ عدالت و تقویٰ: عدالت ایک ایسی باطنی قوت کا نام ہے جو انسان کو گناہوں سے بچاتی اور حق پر قائم رکھتی ہے۔ فقیہ کے لیے یہ صفتِ بدیہی ہے، کیونکہ بے عمل عالم معاشرے کی رہنمائی نہیں کر سکتا[۲]۔

۳۔ شجاعت اور سیاسی بصیرت: حاکم میں اتنی جرات ہونی چاہیے کہ وہ دشمن کے سامنے نہ جھکے، اور اتنی بصیرت ہو کہ وقت کے تقاضوں کو سمجھ کر فیصلے کر سکے[۳]۔

ولایتِ مطلقہ فقیہ — استبداد یا ضرورت؟

یہاں ایک علمی اصطلاح "ولایتِ مطلقہ" کا فہم ضروری ہے۔ یہ آمریت نہیں ہے، بلکہ انتظامی تزاحم کو دور کرنے کا ایک آلہ ہے۔

- فرق: ڈکٹیٹر اپنی خواہش کے تابع ہوتا ہے، جبکہ فقیہ اسلام کے قانون اور امت کی مصلحت کا پابند ہوتا ہے۔ اگر فقیہ ذرہ برابر بھی آمریت کا مظاہرہ کرے، تو وہ خود بخود 'عدالت' کے معیار

[۱] محامد، أسس الحكومة الدينية، جلد ۱، صفحہ ۳۳۔

[۲] کریمی، ولایت فقیہ، جلد ۱، صفحہ ۱۷۔

[۳] اعرافی، قلمرو دین و گسترہ شریعت، جلد ۱، صفحہ ۲۸۵۔

سے گر کر ولایت سے معزول ہو جاتا ہے[۱]۔

- حاکمیتِ احکام: ولایتِ مطلقہ کا مطلب یہ ہے کہ حاکمِ وقت، اسلام کے کلی مقاصد کے تحفظ کے لیے عارضی طور پر 'احکامِ ثانویہ' جاری کر سکتا ہے تاکہ معاشرے میں کسی بڑے نقصان کو ٹالا جا سکے[۲]۔

عوامی کردار اور عالمی تناظر

ولایتِ فقیہ میں عوامی رائے کی حیثیت "مقبولیت" کی ہے، جو الٰہی "مشروعیت" کے نفاذ کا واحد راستہ ہے۔

- مجلسِ خبرگان: یہ ادارہ عوامی نمائندوں (فقہاء) پر مشتمل ہوتا ہے، جو رہبر کی شرائط پر نظر رکھتے ہیں اور اس کے انتخاب یا عزل کا فیصلہ کرتے ہیں۔ یہ نظام ثابت کرتا ہے کہ حاکمیتِ الٰہی میں عوام کا ارادہ ایک 'متمم' کی حیثیت رکھتا ہے[۳]۔

ولایتِ فقیہ کا نظام صرف ایران تک محدود نہیں، بلکہ یہ عالمی استکبار کے خلاف ایک قلعہ ہے۔ مغربی تمدن اپنی مادی یلغار سے اسلامی اقدار کو مٹانا چاہتا ہے۔ اس تناظر میں "ثقافتِ مقاومت" کا فروغ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے[۴]۔

---

[۱] لطیفی، مہدویت، حکومت دینی و دموکراسی، جلد ا، صفحہ ۲۱۹۔

[۲] شاکرین، پرسشہا و پاسخہای برگزیدہ، جلد ا، صفحہ ۱۹۴۔

[۳] مرندی، مجموعہ مقالات دومین ہمایش مردمسالاری دینی، جلد ۲، صفحہ ۳۳۳۔

[۴] آصفی، المبانی الفقهیہ للمقاومۃ، جلد ا، صفحہ ۹۔

نظامِ ولایتِ فقیہ کا مطالعہ ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ یہ نظام عقل اور وحی کا وہ حسین امتزاج ہے جو انسان کو مادی اور روحانی دونوں اعتبار سے کمال تک پہنچاتا ہے۔ یہ نظریہ ثابت کرتا ہے کہ اسلام کے پاس زندگی کے ہر شعبے، بشمول سیاست و ریاست، کے لیے ایک جامع نقشہ موجود ہے۔

دورِ حاضر میں ضرورت اس امر کی ہے کہ برصغیر کے اہل دانش اس نظریے کی گہرائی کو سمجھیں، تاکہ دشمن کی طرف سے پھیلائی گئی تفرقہ انگیز سازشوں، جیسے انحرافی فرقوں کے نام نہاد 'اسلام'، اور حقیقی 'اسلامِ محمدی' کے درمیان تمیز کی جاسکے[1]۔

بعض شبہات کا علمی جائزہ اور ازالہ

یہاں ہم ان تین بڑے اعتراضات کا جائزہ لیں گے جو عام طور پر ولایتِ فقیہ کے نظام پر کیے جاتے ہیں:

شبہہ ۱: کیا ولایتِ فقیہ "علماء کی حکومت" کا نام ہے؟

اعتراض: ناقدین کا کہنا ہے کہ یہ نظام محض ایک خاص طبقے (مولاناؤں) کی حکمرانی قائم کرتا ہے، جس میں عام ماہرینِ فن کی کوئی جگہ نہیں۔

جواب: تخصص بمقابلہ طبقہ: ولایتِ فقیہ "مولاناؤں کی حکومت" نہیں بلکہ "فقاہت اور تخصص کی حکومت" ہے۔ اسلام میں حکمرانی کا معیار لباس یا طبقہ نہیں، بلکہ "شرائط" ہیں۔ جس طرح ایک ہسپتال کو چلانے کے لیے ڈاکٹر اور ایک انجینئرنگ پروجیکٹ کے لیے انجینئر ضروری ہے، اسی طرح "اسلامی نظام" کے نفاذ کے لیے اس قانون کے ماہر (فقیہ) کی ضرورت ہے۔

- انتظامی امور میں ماہرین کا کردار: فقیہ کا کام کلی پالیسی سازی اور اسلامی حدود کی نگرانی ہے۔

---

[1] اعرافی، چیستی، حوزہ علمیہ۔ گذشتہ، حال، آیندہ، جلد ۱، صفحہ ۲۷۳۔

نظام کے دیگر شعبے (معیشت، دفاع، ٹیکنالوجی) متعلقہ فن کے ماہرین ہی چلاتے ہیں، جیسا کہ ایران میں موجودہ نظامِ ولایتِ فقیہ میں وزارتیں اور ادارے ماہرینِ فن کے سپرد ہیں[۱]۔

شبہہ ۲: اگر ولئ فقیہ سے غلطی ہو جائے تو کیا ہو گا؟ (مقامِ عصمت اور مسئولیت)

اعتراض: ولیِ فقیہ معصوم نہیں ہے، اگر وہ سیاسی یا انتظامی طور پر کوئی بڑی غلطی کرے یا آمریت کی طرف مائل ہو جائے تو اسے کون روکے گا؟

جواب: عدالت کا ضابطہ: ولئ فقیہ کے لیے "عدالت" بنیادی شرط ہے۔ امام خمینیؒ کے بقول، اگر فقیہ زندگی میں ایک بار بھی ڈکٹیٹر شپ یا ذاتی مفاد کی خاطر کوئی فیصلہ کرے، تو وہ اسی لمحے اپنی "ولایت" سے خود بخود معزول ہو جاتا ہے[۲]۔ مجلسِ خبرگان (ادارہ جاتی نظارت): یہ نظام فردِ واحد پر نہیں بلکہ ادارہ جاتی نگرانی پر قائم ہے۔ "مجلسِ خبرگان" (نخبگان کا ادارہ) مسلسل رہبر کی صفات اور فیصلوں پر نظر رکھتا ہے۔ اگر رہبر اپنی اہلیت کھو دے تو یہ ادارہ اسے ہٹانے کا قانونی اختیار رکھتا ہے[۳]۔

شبہہ ۳: کیا ولایتِ فقیہ صرف ایران کے لیے ہے؟

اعتراض: یہ نظریہ صرف ایک جغرافیائی حد تک محدود ہے اور دیگر ممالک کے مسلمانوں کے لیے اس کی کوئی اہمیت نہیں۔

جواب: نظریاتی عالمگیریت: ولایتِ فقیہ ایک "فقہی اور کائناتی" نظریہ ہے، نہ کہ صرف قومی۔ یہ "امتِ

---

[۱] کریمی، ولایت فقیہ، جلد ۱، صفحہ ۹۰۔
[۲] لطیفی، مہدویت، حکومت دینی و دموکراسی، جلد ۱، صفحہ ۲۱۹۔
[۳] محمدی، مجلس خبرگانِ رہبری، جلد ۱، صفحہ ۴۳۔

واحدہ" کے تصور پر مبنی ہے [۱]۔ استکبار کے خلاف ڈھال: آج عالمِ اسلام کو جس "ثقافتی یلغار" اور استعماری دباؤ کا سامنا ہے، ولایتِ فقیہ اس کے خلاف ایک عالمی مزاحمتی ماڈل پیش کرتی ہے۔ فلسطین اور لبنان کی تحریکیں اس کی زندہ مثالیں ہیں جو ثابت کرتی ہیں کہ یہ نظریہ سرحدوں سے بالاتر ہو کر مظلوموں کی حمایت کرتا ہے [۲]۔

اقتدار اور سیاسی درجہ بندی کی منطق

انسانی وجود کی ماہیت اور تاریخِ تمدن کا مطالعہ ہمیں اس بنیادی اور ناقابلِ تردید حقیقت کے روبرو لا کھڑا کرتا ہے کہ "حکومت" انسانی معاشرت کے جسم میں روح کی حیثیت رکھتی ہے۔ انسان، اپنی فطرت اور جبلت کے اعتبار سے "مدنی الطبع" واقع ہوا ہے۔ وہ اپنی جسمانی بقا، نفسیاتی تسکین اور روحانی ارتقاء کے لیے تنہائی کی غار میں پناہ نہیں لے سکتا، بلکہ اسے قدم قدم پر اپنے ہم جنسوں کے تعاون اور اشتراک کی حاجت ہوتی ہے۔ تاہم، یہ اجتماعی زندگی جہاں انسان کی ضرورت ہے، وہیں یہ ایک بہت بڑے چیلنج کا پیش خیمہ بھی ہے۔ جب مختلف مزاج، متضاد خواہشات اور ٹکراتے ہوئے مفادات رکھنے والے انسان ایک جگہ جمع ہوتے ہیں، تو ان کے درمیان "تزاحم" و "تصادم" ایک فطری امر بن جاتا ہے۔ اگر اس تصادم کو کسی ضابطے اور برتر قوت کے تابع نہ کیا جائے، تو انسانی معاشرہ درندوں کے جنگل سے بھی بدتر منظر پیش کرنے لگتا ہے، جہاں "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کا قانون رائج ہوتا ہے۔ اس امکانی انتشار اور انارکی کے آگے بند باندھنے کے لیے انسانی عقل نے جس سب سے طاقتور ادارے کو تخلیق کیا ہے، اسے سیاسیات کی زبان میں "حکومت" یا "ریاست" کا نام دیا جاتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب حکومت ایک ناگزیر انسانی ضرورت ہے، تو اس کی تشکیل اور ساخت کیسی

---

[۱] نصرتی، نظامِ سیاسی اسلام، جلد ۱، صفحہ ۳۰۷۔

[۲] دہشیری، جایگاہ تکافل و رفتارہای حمایتگرانہ در دیپلماسی فرہنگی، جلد ۱، صفحہ ۴۶۱۔

ہونی چاہیے؟ تاریخ کے طویل اور پیچیدہ سفر میں انسانوں نے اپنی اجتماعی دانش سے حکمرانی کے مختلف تجربات کیے ہیں۔ کبھی اقتدار کو ایک فردِ واحد کی مطلق العنان مرضی کے سپرد کیا گیا، تو کبھی اسے چند اشرافیہ کی میراث سمجھا گیا، اور کبھی اسے عوام کی اجتماعی امانت قرار دیا گیا۔ ایک محقق اور سیاسی تجزیہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان تمام تجربات اور حکومتی ماڈلز کا غیر جانبدارانہ اور علمی تجزیہ کرے۔ حکومتوں کی یہ درجہ بندی محض ایک اکادمی مشق نہیں ہے، بلکہ یہ اس بات کو سمجھنے کی کوشش ہے کہ "اختیار" کا منبع کیا ہے؟ اس کا استعمال کیسے ہوتا ہے؟ اور اس کے اثرات معاشرے پر کیا مرتب ہوتے ہیں؟ سیاسی مفکرین نے ان سوالات کے جوابات تلاش کرنے کے لیے دو مختلف تحقیقی مناہج اختیار کیے ہیں، جنہیں سمجھنا ضروری ہے۔

پہلا منہج "تاریخی اور نظریاتی" ہے۔ اس اندازِ فکر میں محققین یہ دیکھتے ہیں کہ ماضی کے عظیم فلسفیوں — جیسے افلاطون، ارسطو، فارابی یا ابنِ خلدون — نے حکومت کی کیا مثالی شکلیں بیان کی ہیں اور انہوں نے حکمرانوں کی درجہ بندی کس اخلاقی بنیاد پر کی ہے؟ مثلاً ارسطو کا یہ کہنا کہ "بادشاہت بگڑ کر آمریت بنتی ہے" اسی تاریخی تجزیے کا حصہ ہے۔ لیکن دوسرا منہج، جو جدید سیاسیات میں زیادہ رائج ہے، وہ "ساختی اور معروضی" منہج ہے۔ اس نقطہ نظر میں ہم محض نظریات پر انحصار نہیں کرتے بلکہ زمینی حقائق اور حکومت کی موجودہ ہیئت کا جائزہ لیتے ہیں۔ ہم یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ عملاً اقتدار کتنے ہاتھوں میں ہے؟ فیصلہ سازی کا عمل کیسا ہے؟ اور عوام کا اس میں کتنا حصہ ہے؟ یہ منہج ہمیں جذبات سے بالاتر ہو کر کسی بھی سیاسی نظام کی کارکردگی اور اس کی حقیقت کو پرکھنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

اس ساختی تجزیے کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے ہم نے چار بنیادی "معیارات" کا تعین کیا ہے، جو کسی بھی سیاسی نظام کی تحلیل و تجزیہ کے لیے کسوٹی کا درجہ رکھتے ہیں۔ پہلا اور سب سے ظاہر معیار "حکمرانوں کی تعداد" ہے؛ یعنی کیا اقتدارِ اعلیٰ ایک شخص کی ذات میں سمٹا ہوا ہے، چند لوگوں کے گروہ میں تقسیم ہے، یا پوری قوم کے پاس ہے؟ یہ سوال ہمیں آمریت اور جمہوریت کے فرق تک لے جاتا ہے۔ دوسرا معیار

"اختیارات کا ارتکاز" ہے؛ یعنی کیا فیصلہ سازی کا تمام تر اختیار صرف دارالحکومت میں ہے یا اسے نچلی سطح پر صوبوں اور اکائیوں میں تقسیم کیا گیا ہے؟ یہ ہمیں مرکزی اور وفاقی نظاموں کا فرق سمجھاتا ہے۔ تیسرا اہم معیار "عوامی شرکت" کی سطح ہے؛ کیا عوام محض رعایا ہیں جنہیں صرف اطاعت کرنی ہے، یا وہ شہری ہیں جو اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتے ہیں؟

تاہم، ایک مسلمان محقق اور صاحبِ بصیرت مصنف کے لیے ان تین معیارات کے ساتھ ساتھ ایک چوتھا اور سب سے اہم معیار بھی موجود ہے، جسے اکثر سیکولر سیاسیات نظر انداز کر دیتی ہے، اور وہ ہے "جہان بینی" (Worldview)۔ یہ معیار سب سے زیادہ بنیادی ہے کیونکہ یہ حکومت کی جڑوں سے بحث کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس حکومت کا "قبلہ" کیا ہے؟ کیا یہ نظامِ حکومت انسان کو محض ایک مادی جانور سمجھ کر اس کی جسمانی ضروریات پوری کرنا چاہتا ہے (طاغوتی و مادی نظام)، یا یہ انسان کو ایک روحانی اور ابدی مخلوق سمجھ کر اس کی زندگی کو وحیِ الٰہی کی روشنی میں استوار کرنا چاہتا ہے (الٰہی نظام)؟ یہی وہ مقام ہے جہاں اسلامی نظریۂ سیاست، مغرب کے لبرل ڈیموکریسی اور سوشلزم جیسے نظاموں سے جدا ہوتا ہے۔ زیرِ نظر فصل میں ہم حکومت کی اقسام کا جائزہ انہی دقیق اور جامع معیارات کی روشنی میں لیں گے، تاکہ "نظامِ ولایتِ فقیہ" کے خدوخال کو سمجھنے کے لیے ایک مضبوط علمی بنیاد فراہم ہو سکے۔

حکومت کا مفہوم، اقسام اور درجہ بندی

۱۔ حکمرانوں کی تعداد اور اقتدار کی تقسیم

سیاسیات کے میدان میں جب ہم حکومتوں کی ساخت کا جائزہ لیتے ہیں، تو سب سے پہلا اور بنیادی سوال جو ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ "فیصلہ سازی کا اختیار" کتنے افراد کے پاس ہے؟ کیا یہ اختیار ایک فردِ واحد کی مٹھی میں بند ہے؟ کیا یہ چند مخصوص خواص کی جاگیر ہے؟ یا پھر یہ پوری قوم کی مشترکہ امانت ہے؟ اس بنیاد پر

سیاسی مفکرین نے حکومتوں کو تین بنیادی اقسام میں تقسیم کیا ہے۔ ذیل میں ہم ان تینوں اقسام کا ایک جائزہ پیش کرتے ہیں:

(الف) حکومتِ فردِ واحد

یہ انسانی تاریخ کا قدیم ترین، سب سے مانوس، لیکن ساتھ ہی سب سے زیادہ متنازعہ طرزِ حکومت رہا ہے۔ اس نظام کی بنیاد اس فلسفے پر ہے کہ معاشرے کو چلانے کے لیے ایک "مطلق العنان سربراہ" کی ضرورت ہے جس کا حکم قانون کا درجہ رکھے۔ اسے تاریخ میں کبھی "بادشاہت"، کبھی "ملوکیت" اور کبھی "آمریت" کے ناموں سے یاد کیا گیا۔ اس نظام کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس میں حکمران خود کو "لایُسئَل" (جس سے باز پرس نہ ہو سکے) سمجھتا ہے اور اپنی رعایا کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکتا ہے۔

قرآنِ کریم، جو انسانی نفسیات اور سماجی عروج و زوال کا سب سے سچا عکاس ہے، اس نے بادشاہت کے مزاج کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کے دو بنیادی نقائص کی نشاندہی کی ہے: ایک "فساد" اور دوسرا "تذلیلِ انسانیت"۔ ملکہ سبا (بلقیس) کا یہ قول قرآن نے نقل کیا ہے جو در حقیقت ملوکیت کی نفسیاتی کیفیت کو بیان کرتا ہے: ﴿إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً ۖ وَكَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ﴾ "بے شک بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اسے فاسد (تباہ و برباد) کر دیتے ہیں اور وہاں کے عزت داروں کو ذلیل و خوار کر دیتے ہیں، اور یہ (بادشاہ) ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔"[۱]

یہ آیت محض ایک تاریخی واقعہ نہیں بلکہ ایک "سیاسی کلّیہ" بیان کر رہی ہے کہ مطلق العنان اقتدار انسان کو فرعونیت کی طرف لے جاتا ہے جہاں وہ معاشرتی اقدار کو پامال کرتا ہے۔ عصرِ حاضر میں اس شخصی حکومت

---

[۱] سورہ نمل: ۳۴۔

کی کئی اَشکال موجود ہیں، جن کا باریک بینی سے جائزہ لینا ضروری ہے:

۱.۱ موروثی بادشاہت

یہ وہ فرسودہ نظام ہے جس کی بنیاد "عقل و اہلیت" کے بجائے "حیاتیاتی تسلسل" پر ہے۔ اس میں یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ ایک بادشاہ کا بیٹا ہونے کی وجہ سے اگلا فرد بھی حکمرانی کا حقدار ہے۔ اقتدار کی منتقلی کسی آئین یا عوامی رائے دہی کے بجائے شاہی خاندان کی اندرونی روایات اور رسومات کے تحت ہوتی ہے۔ اس نظام میں عوام کی حیثیت محض "تماشائی" کی ہوتی ہے۔ [۱]

۲.۱ استبدادی بادشاہت

یہ شخصی حکومت کی وہ خطرناک شکل ہے جہاں بادشاہ قانون، عدلیہ اور مقننہ سے بالاتر ہوتا ہے۔ لوئی چہاردہم کا مشہور جملہ "میں ہی ریاست ہوں" اس نظام کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ اس میں بادشاہ کی ذاتی خواہش قانون بن جاتی ہے۔ ماضی میں مسلمان حکمرانوں کے ہاں بھی یہ بگاڑ پیدا ہوا کہ انہوں نے خلافت کو "ملوکیتِ مطلقہ" میں بدل دیا، جس کے نتیجے میں عدل و انصاف کی جگہ ذاتی وفاداریوں نے لے لی۔ [۲]

۳.۱ انتخابی بادشاہت

تاریخ کے دھندلکوں میں ہمیں کچھ ایسے شواہد ملتے ہیں جہاں بادشاہ کا انتخاب قبائلی سردار یا عمائدین کرتے تھے۔ تاہم، انسان کی اقتدار پسندی نے جلد ہی اس جمہوری روح کو ختم کر دیا اور بادشاہوں نے اپنی زندگی

---

[۱] قاسم شبان نیا، فلسفہ سیاست، صفحہ ۲۔

[۲] قاسم شبان نیا، فلسفہ سیاست، صفحہ ۲۔

میں ہی اپنے بیٹوں کو ولی عہد نامزد کرنا شروع کر دیا، یوں یہ نظام بھی موروثیت کی نذر ہو گیا۔ [۱]

۴. آئینی بادشاہت

یورپ میں نشاۃِ ثانیہ اور جمہوری تحریکوں کے بعد بادشاہت کی ایک نئی شکل سامنے آئی۔ اس میں بادشاہ کے وجود کو تو برقرار رکھا گیا لیکن اس کے "پنجے اور دانت" نکال دیے گئے۔ برطانیہ اور جاپان اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ یہاں بادشاہ یا ملکہ صرف "ریاست کی علامت" ہیں، جبکہ حقیقی انتظامی طاقت منتخب پارلیمنٹ کے پاس ہے۔ یہ در حقیقت جمہوریت اور روایت کا ایک سمجھوتہ ہے۔ [۲]

(ب) گروہی یا طبقاتی حکومت

حکومت کی دوسری بڑی قسم وہ ہے جہاں اقتدار کسی ایک فرد کے پاس نہیں، بلکہ معاشرے کے ایک "مخصوص طبقے" کے پاس ہوتا ہے۔ یہ طبقہ کبھی اپنی "دولت" کی بنیاد پر، کبھی "اعلیٰ نسل" کے زعم میں، اور کبھی "فکری برتری" کے دعوے کے ساتھ عوام پر مسلط ہوتا ہے۔ اس کی درج ذیل صورتیں قابلِ غور ہیں:

۱. ۲ارسٹوکریسی (Aristocracy)

یونانی فلسفے میں اس کا مطلب "بہترین لوگوں کی حکومت" تھا۔ افلاطون کا خیال تھا کہ حکومت صرف فلسفیوں اور دانا لوگوں کا حق ہے۔ نظریاتی طور پر یہ ایک خوش کن تصور ہے کہ معاشرے کے ذہین ترین لوگ حکومت کریں، لیکن عملی دنیا میں "ارسٹوکریسی" ہمیشہ موروثی جاگیرداروں اور نوابوں کی حکومت بن

---

[۱] قاسم شبان نیا، صفحہ ۳۔

[۲] قاسم شبان نیا، فلسفہ سیاست، صفحہ ۳۔

کر رہ گئی، جنہوں نے عوام کو کیڑے مکوڑے سمجھا۔[۱]

۲.۲ الیگارشی (Oligarchy)

جب اشرافیہ کی حکومت بگڑ جائے اور اس کا مقصد صرف "اپنے طبقے کا مفاد" بن جائے تو ارسطو اسے "الیگارشی" کہتا ہے۔ یہ دراصل "سرمایہ دارانہ آمریت" ہے۔ دورِ حاضر کی مغربی جمہوریتیں، جن پر کارپوریٹ کلچر اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کا غلبہ ہے، درحقیقت "الیگارشی" کی جدید شکلیں ہیں۔ وہاں الیکشن وہی جیتتا ہے جس کے پاس اربوں روپے کی فنڈنگ ہو۔ لہٰذا یہ جمہوریت کے لبادے میں "دولت مندوں کا راج" ہے۔[۲]

۲.۳ نخبگان کی حکومت (Elitism)

بیسویں صدی میں سیاسیات میں "ایلیٹ تھیوری" سامنے آئی۔ اس کے مطابق چاہے نظام جمہوری ہو یا آمرانہ، فیصلے ہمیشہ چند "نخبگان" (Top Elites) ہی کرتے ہیں۔ فاشزم میں یہ "پارٹی ایلیٹ" ہوتے ہیں اور کمیونزم میں یہ "پولیٹ بیورو" کے اراکین ہوتے ہیں۔ اسلام اس تصور کو رد کرتا ہے کہ صرف ایک خاص طبقہ ہی حکمرانی کا حق رکھتا ہے؛ اسلام میں حکمرانی کا معیار "اہلیت اور تقویٰ" ہے، چاہے وہ کوئی حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو۔[۳]

(ج) جمہوری حکومت

جدید دور میں شعور کی بیداری کے ساتھ "جمہوریت" یا "ری پبلک" کا تصور سب سے توانا ہو کر ابھرا ہے۔ اس نظام کی روح یہ ہے کہ اقتدار اللہ کی امانت ہے جو عوام کی وساطت سے حکمرانوں تک پہنچتا

---

[۱] قاسم شبان نیا، فلسفہ سیاست، صفحہ ۳۔

[۲] قاسم شبان نیا، فلسفہ سیاست، صفحہ ۳۔

[۳] قاسم شبان نیا، فلسفہ سیاست، صفحہ ۴۔

ہے۔ اس میں حکمران "مالک" نہیں بلکہ "ملازم" ہوتا ہے، جو ایک معاہدے (آئین) کے تحت محدود مدت کے لیے آتا ہے۔ اس کی ساخت کے اعتبار سے دو بڑی قسمیں ہیں:

۱.۳ صدارتی نظام

اس ماڈل (جیسے امریکہ) میں صدرِ مملکت براہِ راست عوام سے مینڈیٹ لیتا ہے۔ وہ اپنی کابینہ بنانے میں آزاد ہوتا ہے اور پارلیمنٹ کے دباؤ سے نسبتاً آزاد ہوتا ہے۔ اس کا فائدہ "فیصلہ سازی میں تیزی" اور "استحکام" ہے، لیکن اس کا نقصان یہ ہے کہ اگر صدر غلط راستے پر چل پڑے تو اسے ہٹانا مشکل ہو جاتا ہے، اور یہ کبھی کبھی "قانونی آمریت" کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔[۱]

۲.۳ پارلیمانی نظام

اس ماڈل (جیسے ہندوستان - پاکستان) میں پارلیمنٹ طاقت کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ وزیرِاعظم تب تک حاکم رہتا ہے جب تک اسے ایوان کا اعتماد حاصل ہو۔ اس نظام کا حسن "مشاورت" اور "احتساب" میں ہے، کیونکہ وزیرِاعظم ہر روز پارلیمنٹ کو جواب دہ ہے۔ لیکن اس کا منفی پہلو یہ ہے کہ کمزور اتحادی حکومتوں کی وجہ سے سیاسی عدمِ استحکام پیدا ہو سکتا ہے۔[۲]

ایک تنقیدی نوٹ: یہ بات ذہن نشین رہے کہ محض "جمہوریہ" کا لیبل لگا لینے سے کوئی حکومت منصفانہ نہیں ہو جاتی۔ دنیا میں ایسی کئی "جمہوریتیں" ہیں جو دراصل "سول ڈکٹیٹر شپ" ہیں۔ اسلامی نقطہ نظر سے جمہوریت اس وقت تک ادھوری اور خطرناک ہے جب تک اسے "اخلاقیات" اور "وحی" کی لگام نہ ڈالی جائے۔ مغربی جمہوریت اگر "۵۱ فیصد" کی اکثریت سے شراب کو حلال اور فحاشی کو جائز قرار دے سکتی ہے، تو اسلام ایسی "مطلق آزادی" کو مسترد کرتا ہے۔ اسلام "جمہوری طریقہ کار" (Election) کو تو قبول کرتا

---

[۱] قاسم شبان نیا، فلسفہ سیاست، صفحہ ۴،۵۔

[۲] قاسم شبان نیا، فلسفہ سیاست، صفحہ ۵۔

ہے لیکن "قانون سازی" میں اللہ کے حکم کو مقدم رکھتا ہے۔[1]

حکومت کی ساختی اور نظریاتی درجہ بندی

۲۔ اختیارات کے ارتکاز اور جغرافیائی تقسیم

حکومتی ڈھانچے کو سمجھنے کے لیے محض یہ جاننا کافی نہیں کہ حکمران کتنے ہیں، بلکہ یہ دیکھنا بھی از حد ضروری ہے کہ "اختیارات" کا جغرافیائی پھیلاؤ کس نوعیت کا ہے؟ کیا ریاست کے تمام تر انتظامی اور قانونی اختیارات ایک ہی مرکز میں سمٹے ہوئے ہیں، یا انہیں نچلی سطح پر تقسیم کیا گیا ہے؟ اس بنیاد پر جدید ریاستیں دو بڑے ماڈلز میں تقسیم ہوتی ہیں:

(الف) مرکزی حکومت

اس طرزِ حکومت میں اقتدار کا سرچشمہ صرف اور صرف "مرکز" (Capital) ہوتا ہے۔ ملک کے تمام صوبے، اضلاع یا میونسپلٹیاں محض انتظامی سہولت کے لیے بنائی جاتی ہیں اور ان کی اپنی کوئی مستقل آئینی حیثیت یا خود مختاری نہیں ہوتی۔ مقامی اکائیاں وہی کچھ کرنے کی مجاز ہوتی ہیں جس کی اجازت مرکز انہیں دیتا ہے، اور مرکز جب چاہے یہ اختیارات واپس لے سکتا ہے۔

- فلسفہ: اس نظام کا بنیادی فلسفہ "یکجہتی اور یکسانیت" ہے۔ یہ ان ممالک کے لیے موزوں ہے جو رقبے میں چھوٹے ہوں یا جہاں کی آبادی نسلی اور لسانی اعتبار سے "ہم آہنگ" ہو (جیسے فرانس یا جاپان)۔

- خامی: اس نظام میں مقامی لوگوں کو فیصلہ سازی میں شرکت کا احساس کم ہوتا ہے اور دور دراز

[1] قاسم شبان نیا، فلسفہ سیاست، صفحہ ۶۔

کے علاقوں کے مسائل مرکزی بیوروکریسی میں دب کر رہ جاتے ہیں۔[۱]

(ب) وفاقی حکومت

یہ نظام آج کی دنیا میں زیادہ مقبول ہے، بالخصوص ان ممالک میں جو رقبے میں وسیع ہیں یا جہاں نسلی، لسانی اور مذہبی تنوع پایا جاتا ہے (جیسے ہندوستان، پاکستان، امریکہ)۔ وفاقی نظام میں اقتدار کسی ایک شخص یا مرکز کی جاگیر نہیں ہوتا، بلکہ ملک کا "آئین" (Constitution) طاقت کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے:

۱. وفاقی حکومت (مرکز): جس کے پاس دفاع، خارجہ پالیسی، کرنسی اور بین الاقوامی تجارت جیسے قومی امور ہوتے ہیں۔

۲. صوبائی حکومتیں (اکائیاں): جو اپنے داخلی معاملات (تعلیم، صحت، پولیس، بلدیات) میں آئینی طور پر خود مختار ہوتی ہیں۔

- فلسفہ: اس کا مقصد "کثرت میں وحدت" (Unity in Diversity) پیدا کرنا ہے۔ یہ نظام اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ مختلف علاقوں کی ثقافت اور ضروریات مختلف ہو سکتی ہیں، لہٰذا انہیں اپنے فیصلے خود کرنے کا حق ہونا چاہیے۔[۲]

۳۔ عوامی شراکت اور آزادی کے اعتبار سے تقسیم

ایک اور اہم زاویہ نگاہ یہ ہے کہ ریاست اپنے شہریوں کو کس حد تک آزادی دیتی ہے اور ریاستی امور میں ان کی شرکت کی کیا نوعیت ہے؟ اس کسوٹی پر پرکھیں تو دو متضاد تصویریں سامنے آتی ہیں:

---

[۱] قاسم شبان نیا، فلسفہ سیاست، صفحہ ٦۔

[۲] قاسم شبان نیا، فلسفہ سیاست، صفحہ ٦۔

(الف) ٹوٹیلیٹرین حکومت: جدید دور کا فرعون

بیسویں صدی نے استبداد کی ایک نئی اور خوفناک شکل دیکھی جسے "ٹوٹیلیٹرین" یا "کلیت پسند" حکومت کہا جاتا ہے۔ یہ اصطلاح سب سے پہلے اطالوی ڈکٹیٹر مسولینی نے استعمال کی تھی۔ اس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ: *"سب کچھ ریاست کے لیے ہے، ریاست کے باہر کچھ نہیں، اور ریاست کے خلاف کچھ نہیں۔"*

یہ نظام بادشاہت سے زیادہ خطرناک ہے کیونکہ بادشاہت میں رعایا کی نجی زندگی میں مداخلت کم ہوتی تھی، لیکن ٹوٹیلیٹرین نظام جدید ٹیکنالوجی، جاسوسی اور میڈیا کے زور پر انسان کی "نجی زندگی"، اس کی سوچ، عقیدے اور خاندانی تعلقات کو بھی کنٹرول کرتا ہے۔ نازی جرمنی اور اشتراکی روس (Soviet Union) اس کی بدترین مثالیں تھیں۔

اسلام ایسے نظام کو "شرکِ جدید" سمجھتا ہے۔ اسلام میں حکومت کا دائرہ کار محدود ہے؛ وہ شہریوں کی چار دیواری میں جھانکنے یا ان کے ضمیر پر پہرہ بٹھانے کی مجاز نہیں ہے۔ اسلام میں انسان اللہ کا بندہ ہے، ریاست کا غلام نہیں۔[1]

۴۔ جہان بینی (Worldview) کے اعتبار سے تقسیم: بحث کا حاصل

ایک مسلمان مفکر اور محقق کے لیے اوپر بیان کی گئی تمام تقسیمیں (بادشاہت، جمہوریت، وفاق وغیرہ) ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ اصل اور فیصلہ کن تقسیم وہ ہے جو "نظریہ حیات" اور "حاکمیت کے منبع" کی بنیاد پر کی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے روئے زمین پر صرف دو ہی قسم کی حکومتیں ممکن ہیں: یا وہ "حکومتِ الٰہیہ" ہوگی یا "حکومتِ طاغوت"۔ تیسری کوئی صورت ممکن نہیں۔

---

[1] قاسم شبان نیا، فلسفہ سیاست، صفحہ ۷۔

(الف) حکومتِ الٰہیہ

یہ وہ مثالی نظام ہے جس میں اقتدارِ اعلیٰ اور قانون سازی کا حق صرف اس ہستی کو حاصل ہے جس نے انسان اور کائنات کو تخلیق کیا ہے۔ چونکہ اللہ ہی انسان کی فطرت، اس کی ضروریات اور اس کے انجام سے کماحقہ واقف ہے، لہٰذا اسی کا قانون انسان کو فلاح دے سکتا ہے۔

اس نظام میں حکمران (چاہے وہ نبی ہو، امام ہو یا فقیہ) اپنی ذات میں "حاکمِ مطلق" نہیں ہوتا، بلکہ وہ قانونِ الٰہی کا "مجری" (Executor) اور امین ہوتا ہے۔

- معصوم کی حاکمیت: مثالی صورت یہ ہے کہ حاکم "معصوم" ہو (جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ طاہرین علیہم السلام)، تاکہ غلطی اور گناہ کا امکان ہی نہ رہے۔
- ولایتِ فقیہ: زمانہ غیبت میں، جب معصومؑ ظاہری طور پر موجود نہیں، تو عقل اور نقل کا تقاضا ہے کہ حکومت ان لوگوں کے سپرد کی جائے جو معصومؑ کے مشن کو سمجھتے ہوں اور ان سے صفات میں قریب تر ہوں۔ یعنی وہ "فقاہت" (قانون شناسی)، "عدالت" (تقویٰ) اور "کفائت" (انتظامی صلاحیت) کے حامل ہوں۔
- جوابدہی کا تصور: یہ حکومت استبدادی نہیں ہو سکتی کیونکہ اس میں سب سے پہلے حاکم اللہ کو جواب دہ ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسی ہستی بھی اگر اللہ کے حکم میں ذرا سی ترمیم کرتی تو ان کی گرفت کر لی جاتی: ﴿وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ * لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ * ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ﴾ "اور اگر یہ (پیغمبر) ہماری طرف منسوب کر کے کوئی جھوٹی بات کہتے، تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے، پھر ان کی شہ رگ

کاٹ دیتے۔"[۱]

جب نبی کو قانونِ الٰہی میں ترمیم کا حق نہیں، تو کسی عام حکمران یا پارلیمنٹ کو یہ حق کیسے دیا جا سکتا ہے کہ وہ حرام کو حلال کر دے؟ یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جو اسلامی حکومت کو مغربی جمہوریت سے ممتاز کرتا ہے۔[۲]

(ب) حکومتِ طاغوت

اسلامی اصطلاح میں ہر وہ سیاسی نظام "طاغوت" ہے جو وحیِ الٰہی سے ماخوذ نہ ہو، چاہے وہ بظاہر کتنا ہی خوشنما کیوں نہ ہو۔ جس نظام کی بنیاد "ہیومنزم" (انسان پرستی)، مادہ پرستی یا نفسانی خواہشات پر ہو، وہ طاغوتی ہے۔ قرآن اور نہج البلاغہ کی روشنی میں طاغوتی نظام کی تین مہلک خصلتیں ہیں:

۱. استبداد اور خودرائی

طاغوتی حکمران عوامی مصالح کے بجائے اپنی "انا" اور "ہوس" کا اسیر ہوتا ہے۔ وہ معاشرے کو اپنی جاگیر سمجھتا ہے۔ وہ مشورے اور تنقید کو اپنی توہین سمجھتا ہے۔

۲. استئثار

یہ ایک بہت اہم اصطلاح ہے جسے حضرت علی علیہ السلام نے استعمال کیا۔ "استئثار" کا مطلب ہے: "انحصار طلبی" یا "سب کچھ اپنے لیے سمیٹ لینا"۔ یعنی حکومتی وسائل، عہدے اور مراعات کو اپنے خاندان اور حواریوں میں بانٹنا اور عوام کو محروم رکھنا۔

امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں: مَن مَلَكَ اسْتَأْثَرَ؛ "جو (طاغوتی انداز میں) اقتدار پاتا ہے وہ انحصار

[۱] سورہ حاقہ: ۴۶-۴۴۔

[۲] قاسم شبان نیا، فلسفہ سیاست، صفحہ ۹۔

پسند ہو جاتا ہے۔"[۱]

اسلام کا معاشی اور سیاسی نظام "ایثار" پر کھڑا ہے، جبکہ طاغوتی نظام "استئثار" (لوٹ مار) پر۔[۲]

۳. استکبار اور استخفاف

طاغوتی نظام کی بقا اس میں ہے کہ عوام کو ذہنی طور پر پست اور خوفزدہ رکھا جائے۔ فرعون کی حکمت عملی یہی تھی کہ اس نے قوم کو گروہوں میں تقسیم کیا (Divide and Rule) اور انہیں اتنا ذلیل کیا کہ ان میں مزاحمت کی رمق باقی نہ رہے۔ قرآن فرماتا ہے: ﴿فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهُ فَأَطَاعُوهُ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَاسِقِينَ﴾ "پس اس (فرعون) نے اپنی قوم کو ذلیل (ہلکا) کیا تو وہ اس کی اطاعت کرنے لگے، یقیناً وہ نافرمان لوگ تھے۔"[۳]

لہٰذا اسلامی نظامِ حکومت محض ایک انتظامی ڈھانچہ نہیں، بلکہ یہ انسان کی عزتِ نفس کی بحالی اور اسے غیر اللہ کی غلامی سے نکالنے کا نام ہے۔ ولایتِ فقیہ اسی "حکومتِ الٰہیہ" کا تسلسل ہے جو انسان کو طاغوت کے "استئثار" اور "استکبار" سے نجات دلا کر عدلِ الٰہی کے سائے میں لاتی ہے۔

تشکیلِ حکومت کی ضرورت پر دلائل

دلیلِ اول: معاشرتی نظم و نسق کا قیام اور ہرج و مرج کا سدِ باب

یہ حکومت کے حق میں سب سے مضبوط، قدیم اور بدیہی دلیل ہے، جسے منطق کی زبان میں "برہانِ

---

[۱] نہج البلاغہ، حکمت ۱۶۰۔

[۲] قاسم شبان نیا، فلسفہ سیاست، صفحہ ۱۱۔

[۳] سورہ زخرف: ۵۴۔

نظم" بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس دلیل کی عمارت تین بنیادی مقدمات پر کھڑی ہے:

۱. پہلا مقدمہ (ضرورتِ اجتماع): انسان کی زندگی کا نظام اجتماعی تعاون کے بغیر نہیں چل سکتا۔ روٹی کے ایک لقمے سے لے کر خلائی جہاز کی تیاری تک، ہر کام ہزاروں افراد کی مشترکہ محنت کا نتیجہ ہے۔

۲. دوسرا مقدمہ (تصادم کا امکان): جب افراد اکٹھے ہوں گے تو ان کے درمیان "حقوق اور فرائض" کے تعین پر جھگڑا ہونا یقینی ہے۔ اگر کوئی قانون نہ ہو، تو ہر شخص اپنی طاقت کے بل بوتے پر دوسرے کا حق مارنے کی کوشش کرے گا۔ اس کیفیت کو فقہ میں "ہرج و مرج" اور "اختلالِ نظام" کہتے ہیں۔

۳. تیسرا مقدمہ (قوتِ قاہرہ کی ضرورت): قانون کا ہونا کافی نہیں، کیونکہ قانون از خود نفاذ کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ قانون کو نافذ کرنے کے لیے ایک ایسی "قاہرہ قوت" درکار ہے جو سرکش افراد کو لگام دے سکے اور مظلوم کی دادرسی کر سکے۔

نتیجتاً عقلِ سلیم یہ فیصلہ صادر کرتی ہے کہ معاشرتی زندگی کی بقا کے لیے ایک "مرکزی مقتدرہ" (Central Authority) کا ہونا واجب ہے جو امن و امان کی ضمانت دے سکے۔ اگر حکومت نہ ہو تو جان، مال اور عزت محفوظ نہیں رہ سکتی۔ چونکہ "حفظِ ذات" عقل کا سب سے پہلا حکم ہے، لہٰذا وہ ادارہ (حکومت) جو اس تحفظ کا ضامن ہے، اس کا قیام بھی عقلاً واجب قرار پاتا ہے۔ امام علی علیہ السلام کا یہ قول اسی عقلی دلیل کی طرف اشارہ ہے: لَا بُدَّ لِلنَّاسِ مِنْ أَمِيرٍ بَرٍّ أَوْ فَاجِرٍ؛ "لوگوں کے لیے ایک حاکم کا ہونا ناگزیر ہے، خواہ وہ نیک ہو یا بد۔"[1]

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۴۰۔

یعنی بے حکومتی (Anarchy) کا نقصان، ایک ظالم حکومت کے نقصان سے کہیں زیادہ ہے۔ [1]

دلیلِ دوم: بے متولی امور (امورِ حسبیہ) کی کفالت و سرپرستی

ہر انسانی معاشرے میں لاتعداد ایسے امور، ذمہ داریاں اور ضروریات ہوتی ہیں جن کا کوئی "نجی مالک" (Private Owner) یا وارث نہیں ہوتا، لیکن معاشرتی فلاح کے لیے ان کا پورا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ فقہ اسلامی میں ان امور کو "امورِ حسبیہ" کہا جاتا ہے۔ ان کی انجام دہی کے لیے ایک "عمومی سرپرست" (Public Guardian) کی ضرورت ہوتی ہے، اور وہ سرپرست صرف حکومت ہو سکتی ہے۔ اس کی چند اہم صورتیں یہ ہیں:

۱. کمزور طبقات کا تحفظ: معاشرے میں یتیم بچے، لاوارث بیوائیں، ذہنی و جسمانی معذور افراد، اور بے سہارا بزرگ موجود ہوتے ہیں۔ اگر حکومت نہ ہو تو یہ طبقات بھوک اور بیماری سے مر جائیں گے۔ انفرادی صدقات یا این جی اوز (NGOs) کی کوششیں محدود اور غیر یقینی ہوتی ہیں۔ عقل کہتی ہے کہ ریاست کو "والد" کا کردار ادا کرنا چاہیے جو ان لاوارثوں کا وارث بنے۔

۲. عوامی خدمات (Public Goods): سڑکیں، پل، ڈیم، ہوائی اڈے، پارک، اور صفائی کا نظام — یہ ایسے منصوبے ہیں جن پر خطیر سرمایہ لگتا ہے اور ان کا نفع براہِ راست کسی فرد کو نہیں ملتا (Non-excludable)۔ کوئی تاجر اپنے نفع کے لیے سڑک نہیں بنائے گا۔ یہ کام صرف وہ ادارہ کر سکتا ہے جس کے پاس "بیت المال" (Public Treasury) ہو اور جو عوامی فلاح کا پابند ہو۔

[1] مصباح یزدی، حقوق و سیاست در قرآن، صفحہ ۱۴۔

۳. قدرتی آفات کا مقابلہ: زلزلے، سیلاب، وبائی امراض (جیسے کورونا) یا قحط سالی کے دوران جو تباہی آتی ہے، اس سے نمٹنا انفرادی بس کی بات نہیں۔ اس کے لیے ریاستی سطح کی موبلائزیشن درکار ہوتی ہے۔

۴. عوامی اثاثوں کی حفاظت: جنگلات، دریا، پہاڑ، معدنیات اور ساحل کسی فرد کی ملکیت نہیں بلکہ پوری قوم اور آنے والی نسلوں کی امانت ہیں۔ اگر حکومت نہ ہو تو لینڈ مافیاز اور طاقتور گروہ ان قدرتی وسائل پر قبضہ کرلیں گے۔

لہٰذا عقل حکم دیتی ہے کہ ان تمام "بے وارث امور" کو سنبھالنے کے لیے ایک ایسا طاقتور ادارہ موجود ہو جو ان کا انتظام وانصرام کرسکے۔ یہی ادارہ حکومت ہے۔[۱]

دلیلِ سوم: تعلیم، تربیت اور ثقافتی وروحانی ارتقاء

انسان محض "پیٹ" رکھنے والا حیوان نہیں، بلکہ وہ "عقل و روح" کا حامل انسان ہے۔ ایک مہذب معاشرے کی ضرورت صرف روٹی کپڑا نہیں، بلکہ تعلیم اور اخلاقی تربیت بھی ہے۔ حکومت کی ضرورت اس میدان میں دو جہتوں سے ہے:

۱. علمی ترقی اور ترویج: جدید دور میں سائنس، ٹیکنالوجی، میڈیکل اور انجینئرنگ کی تعلیم کے لیے جو انفراسٹرکچر (یونیورسٹیاں، لیبارٹریاں، ریسرچ سینٹرز) درکار ہے، وہ اربوں کھربوں کے سرمائے کا متقاضی ہے۔ یہ سرمایہ کاری صرف ریاست ہی کرسکتی ہے۔ اگر تعلیم کو پرائیویٹ سیکٹر کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جائے تو علم صرف امیروں کی جاگیر بن جائے گا اور قوم جہالت کے اندھیروں میں ڈوب جائے گی۔

---

[۱] مصباح یزدی، حقوق وسیاست در قرآن، صفحہ ۱۵، ۱۶۔

۲. معنوی اور اخلاقی تربیت: ایک نظریاتی (بالخصوص اسلامی) معاشرے میں حکومت کا فرض صرف "معلم" ہونا نہیں، بلکہ "مربی" ہونا بھی ہے۔ عقائد کی حفاظت، اخلاقی اقدار کا فروغ، اور معاشرے کو فکری گمراہیوں سے بچانا ریاست کی ذمہ داری ہے۔ اگر ریاست ثقافتی میدان خالی چھوڑ دے گی، تو بیرونی اور تخریبی افکار نئی نسل کے ذہنوں کو مسخ کر دیں گے۔ حکومت نصابِ تعلیم اور میڈیا کے ذریعے قوم کی فکری سمت متعیّن کرتی ہے۔

لہٰذا انسانیت کے جوہر کو نکھارنے اور معاشرے کو جہالت و گمراہی سے نکال کر علم و عرفان کی روشنی دینے کے لیے ایک منظم ریاستی نظام کا وجود ناگزیر ہے۔[1]

دلیلِ چہارم: معاشی توازن کا قیام اور ارتکازِ دولت کی روک تھام

معیشت کسی بھی معاشرے کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ معاشی سرگرمیوں میں اگر "توازن" نہ ہو تو معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے۔ اس توازن کو قائم رکھنے کے لیے ایک "ریگولیٹری اتھارٹی" (حکومت) کی ضرورت کئی پہلوؤں سے ہے:

۱. وسائل کی منصفانہ تقسیم: اگر معیشت کو مکمل آزاد چھوڑ دیا جائے تو معاشرے کے چند شاطر، فطین اور بے رحم افراد تمام وسائل پر قابض ہو جائیں گے، اور باقی عوام ان کے معاشی غلام بن جائیں گے۔ حکومت ٹیکس، زکوٰۃ اور قوانین کے ذریعے دولت کو امیروں سے لے کر غریبوں کی طرف موڑتی ہے تاکہ دولت چند ہاتھوں میں گردش نہ کرتی رہے۔ ﴿كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ﴾ "تاکہ یہ (مال و دولت) صرف تمہارے

[1] مصباح یزدی، حقوق و سیاست در قرآن، صفحہ ۱۶، ۱۷۔

مالداروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔"[1]

۲. معاشی ناہمواری کا خاتمہ: بسا اوقات کسی ایک شعبے میں (مثلاً رئیل اسٹیٹ) اندھا دھند سرمایہ کاری ہوتی ہے جبکہ زراعت یا صنعت نظر انداز ہو جاتی ہے۔ حکومت اپنی منصوبہ بندی (Planning) کے ذریعے سرمایہ کاری کا رخ ان شعبوں کی طرف موڑتی ہے جو قومی ضرورت ہیں۔

۳. خود انحصاری (Self-Reliance): ایک غیرت مند قوم کے لیے ضروری ہے کہ وہ معاشی طور پر خود کفیل ہو۔ درآمدات و برآمدات کو کنٹرول کرنا اور کرنسی کی قدر کو مستحکم رکھنا صرف حکومت کا کام ہے۔

لہٰذا جنگل کے قانون کی طرح "معاشی جنگل" بننے سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ حکومت بطور "منصف" اور "ناظم" بازار میں موجود ہو اور معاشی انصاف کو یقینی بنائے۔

---

[1] سورۃ الحشر: ۵۹، آیت: ۷۔ "قرآنِ کریم کا یہ اصول اسلامی معاشی نظام کی روح ہے۔ لفظ 'دُولَۃ' سے مراد وہ شے ہے جو ہاتھوں میں گردش کرتی رہے۔ اللہ تعالیٰ نے قومی وسائل اور اموالِ عامہ (انفال) کا اختیار حاکمِ شرع کو اسی لیے دیا ہے تاکہ وہ اس کی منصفانہ تقسیم کو یقینی بنائے۔ اس آیت کا واضح پیغام یہ ہے کہ اگر اسلامی حکومت اور ولایت کا نظام موجود نہ ہو تو معاشرے میں 'ارتکازِ دولت' (Concentration of Wealth) پیدا ہو جاتا ہے، یعنی دولت سمٹ کر صرف چند سرمایہ داروں کی جاگیر بن جاتی ہے اور عام عوام محرومی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا، نظامِ ولایتِ فقیہ دراصل اسی معاشی عدل کے نفاذ کا ضامن ہے۔ قرآنِ مجید کا یہ اصول ﴿كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ﴾ دراصل معاشی استحصال کے تابوت میں آخری کیل ہے۔ نظامِ ولایتِ فقیہ اسی قرآنی منشور کو نافذ کرنے کا نام ہے، جہاں قومی وسائل پر چند سرمایہ داروں کا قبضہ نہیں ہوتا، بلکہ بیت المال پر سب سے پہلا حق اس محروم طبقے کا ہوتا ہے جسے تاریخ کے فرعونوں نے ہمیشہ کچلا ہے۔ یہ آیت پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ دولت کو قید مت کرو، اسے گردش میں لاؤ تاکہ معاشرہ زندہ رہ سکے۔"

دلیلِ پنجم: قومی دفاع اور دشمنوں کے خلاف مزاحمت

یہ ایک ایسی دلیل ہے جس پر دنیا کے تمام عقلاء، چاہے وہ مذہبی ہوں یا دہریے، متفق ہیں۔ انسانی تاریخ امن سے زیادہ جنگوں کی داستان ہے۔ ہر معاشرے کو بیرونی جارحیت، لوٹ مار اور قبضے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔

۱. جدید عسکری تقاضے: ماضی میں شاید قبائلی لشکر تلواروں سے دفاع کر لیتے تھے، لیکن آج کا دفاع انتہائی پیچیدہ ٹیکنالوجی (میزائل، ایٹمی طاقت، سائبر وار فیئر، فضائیہ) کا متقاضی ہے۔ یہ جدید ترین اسلحہ بنانا یا خریدنا اور لاکھوں کی فوج کو پالنا کسی پرائیویٹ ملیشیا کے بس کی بات نہیں۔ یہ صرف "قومی بجٹ" اور ریاستی وسائل سے ممکن ہے۔

۲. اسٹریٹجک پلاننگ: دفاع صرف ہتھیار کا نام نہیں، بلکہ "حکمت عملی" کا نام ہے۔ انٹیلی جنس نیٹ ورک، دشمن کی چالوں پر نظر، اور جنگ کے دوران "مرکزی کمان" کا ہونا فتح کے لیے ضروری ہے۔ بکھرا ہوا معاشرہ کبھی بھی منظم دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

۳. قوتِ رعب: عقل کہتی ہے کہ: "اگر تم امن چاہتے ہو تو جنگ کے لیے تیار رہو۔" حکومت اپنی فوجی طاقت کے ذریعے دشمن کے دل میں ایسا رعب ڈالتی ہے کہ وہ حملے کی جرات نہیں کرتا۔

لہٰذا قوم کی جان، مال، آبرو اور جغرافیائی و نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کے لیے ایک مقتدر حکومت اور منظم فوج کا وجود عقل کا اولین تقاضا ہے۔[1]

---

[1] مصباح یزدی، حقوق و سیاست در قرآن، صفحہ ۱۸،۱۹۔

دلیلِ ششم: تنازعات کا حل اور نظامِ عدل

معاشرتی زندگی میں افراد اور گروہوں کے درمیان مفادات کا ٹکراؤ اور جھگڑے ہونا ایک فطری امر ہے۔ کبھی جائیداد کا تنازعہ، کبھی خاندانی مسائل، اور کبھی تجارتی لین دین میں اختلاف۔ ان تنازعات کو حل کرنے کے لیے ایک "غیر جانبدار ثالث" (Arbiter) کی ضرورت ہوتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا یہ ثالثی نجی طور پر نہیں ہو سکتی؟ ہو سکتی ہے، لیکن اس میں دو بڑے مسائل ہیں:

۱. قبولیت کا مسئلہ: فریقین کا کسی ایک شخص پر متفق ہونا مشکل ہوتا ہے۔

۲. نفاذ کا مسئلہ: سب سے اہم بات یہ ہے کہ اگر ثالث فیصلہ سنا دے، تو ہارنے والا فریق اسے ماننے سے انکار کر سکتا ہے۔ یہاں ضرورت پڑتی ہے ایک ایسی طاقت کی جو فیصلے کو "بزورِ قوت" نافذ کروا سکے۔

لہٰذا حکومت ہی وہ ادارہ ہے جو "عدلیہ" (Judiciary) قائم کرتی ہے، جج مقرر کرتی ہے اور پھر "پولیس" (ExecutiveForce) کے ذریعے اس کے فیصلوں پر عملدرآمد کرواتی ہے۔ اگر حکومت نہ ہو تو "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کا قانون چل نکلے گا۔ پس عدل کا قیام حکومت کے وجود پر منحصر ہے۔[۱]

دلیلِ ہفتم: تغیر پذیر حالات اور انتظامی قوانین

یہ دلیل انتہائی لطیف اور باریک ہے۔ ہر معاشرے کے پاس کچھ بنیادی قوانین (آئین یا شریعت) ہوتے ہیں جو کلی اور مستقل ہوتے ہیں۔ لیکن انسانی زندگی جامد نہیں، اس میں روزانہ نئے مسائل اور تغیرات

---

[۱] مصباح یزدی، حقوق و سیاست در قرآن، صفحہ ۱۹، ۲۰۔

آتے ہیں۔ مثلاً:

- ٹریفک کا بہاؤ کیسے کنٹرول ہو گا؟
- شہر میں عمارتیں کتنی اونچی بنیں گی؟
- کس ملک سے تجارت کرنی ہے اور کس پر پابندی لگانی ہے؟
- اشیاء کی قیمتیں کیا ہوں گی؟

یہ ہزاروں "جزوی مسائل" ہیں جن کا حل مستقل قانون میں نہیں ملتا۔ ان کے لیے فوری طور پر "انتظامی احکامات" اور "ضمنی قوانین" کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان وقتی قوانین کو وضع کرنا اور بدلتے حالات کے مطابق تبدیل کرنا "حکومت" (انتظامیہ) کا کام ہے۔ اگر حکومت نہ ہو تو جدید شہری زندگی ایک دن بھی نہیں چل سکتی اور سارا نظام جام ہو جائے گا۔

ان دلائل کا نچوڑ یہ ہے کہ "حکومت" انسانی معاشرے کے لیے کوئی اضافی سہولت نہیں ہے، بلکہ یہ ایک "وجودی ضرورت" ہے۔ عقلِ انسانی حتمی فیصلہ صادر کرتی ہے کہ انارکی، جہالت، غربت اور ظلم سے بچنے کا واحد راستہ ایک "نظامِ حکومت" کا قیام ہے۔

اسلامی حکومت کے قیام پر دلائل

ا۔ عقل اور نقل کا حسین امتزاج

اسلامی نظامِ فکر میں "عقل" اور "وحی" (نقل) دو متضاد چیزیں نہیں ہیں، بلکہ یہ ایک ہی حقیقت تک پہنچنے کے دو راستے ہیں۔ گزشتہ بیان میں عقلِ سلیم نے جس حقیقت (یعنی ضرورتِ حکومت) کا ادراک کیا تھا، شریعتِ اسلامیہ اسی حقیقت پر مہرِ تصدیق ثبت کرتی ہے۔ اگر ہم قرآنِ کریم کی آیات، رسولِ اکرم ﷺ

کی سیرتِ طیبہ، ائمہ معصومین علیہم السلام کے ارشادات اور فقہِ اسلامی کی ساخت کا مطالعہ کریں، تو یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ اسلام محض چند انفرادی عبادات (نماز، روزہ) کا مجموعہ نہیں، بلکہ ایک مکمل "ضابطہ حیات" اور "نظامِ زندگی" ہے۔ اور یہ بدیہی بات ہے کہ کوئی بھی "نظام" ایک "ناظم" یا حکومت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔

زیرِ نظر بیان میں ہم اُن ٹھوس شرعی اور نقلی دلائل کا جائزہ لیں گے جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ "اسلامی حکومت" کا قیام امتِ مسلمہ پر ایک شرعی فریضہ ہے۔

دلیلِ اول: اسلام کی جامعیت اور دینِ فطرت کا تقاضا

علامہ طباطبائیؒ اپنی شہرہ آفاق تفسیر "المیزان" میں فرماتے ہیں کہ اسلام "دینِ فطرت" ہے۔ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے: ﴿فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ﴾ "(اے نبیؐ!) آپ اپنا رخ دینِ حنیف (اسلام) کی طرف جمائے رکھیں، (یہی) اللہ کی وہ فطرت ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی خلقت میں کوئی تبدیلی نہیں، یہی مضبوط اور قائم رہنے والا دین ہے۔"[1]

چونکہ انسان کی "فطرت" یہ ہے کہ وہ مدنی الطبع (Social) ہے اور اسے اجتماعی زندگی گزارنے کے لیے ایک نظم و نسق (حکومت) کی ضرورت ہے۔ لہٰذا یہ ناممکن ہے کہ خالقِ کائنات نے جو دین انسان کی فطرت کے مطابق بھیجا ہو، وہ انسان کی اس سب سے بڑی اور بنیادی ضرورت سے غافل ہو۔ اگر اسلام سیاست، معیشت اور حکومت کے بارے میں خاموش ہو جائے اور اسے انسانوں کی ذاتی مرضی (طاغوت) پر چھوڑ دے، تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اسلام "ناقص" ہے (نعوذ باللہ)۔ حالانکہ اللہ کا فرمان ہے: ﴿الْيَوْمَ

[1] سورہ روم: ۳۰۔

أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ﴾۔ پس دین کا کامل ہونا اسی وقت صادق آتا ہے جب وہ انسان کی انفرادی زندگی کے ساتھ ساتھ اجتماعی اور سیاسی زندگی کی بھی رہنمائی کرے، اور یہ رہنمائی "اسلامی حکومت" کے بغیر ممکن نہیں۔[1]

دلیلِ دوم: اسلامی قوانین کی "ماہیت"

یہ فقہاء، بالخصوص امام خمینیؒ کا پسندیدہ اور مضبوط ترین استدلال ہے۔ اگر ہم اسلامی احکام اور قوانین کی "ساخت" اور "نیچر" پر غور کریں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوانین کسی فردِ واحد کے لیے نہیں بلکہ ایک "ریاست" کے لیے بنائے گئے ہیں۔ ان قوانین کا نفاذ حکومت کے بغیر سِرے سے ممکن ہی نہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱. مالیاتی قوانین: اسلام میں زکوٰۃ، خمس، خراج (Land Tax) اور جزیہ (Protection Tax) کا ایک وسیع نظام ہے۔ ان محاصل کو وصول کرنا، ان کا حساب رکھنا، بیت المال میں جمع کرنا اور پھر انہیں مصارف پر خرچ کرنا — یہ سب ایک وسیع ریاستی ڈھانچے کا تقاضا کرتے ہیں۔ کیا کوئی فردِ واحد یہ نظام چلا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

۲. فوجی اور دفاعی قوانین: اسلام میں "جہاد" کا حکم ہے، چاہے وہ دفاعی ہو یا اقدامی۔ فوج کی تیاری ﴿وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ﴾، صلح کے معاہدے، اور سرحدوں کی حفاظت۔ یہ کام پرائیویٹ ملیشیا کا نہیں بلکہ ایک مقتدر حکومت کا ہے۔

۳. جزائی قوانین: اسلام میں چوری، زنا، بہتان اور قتل کے لیے سخت سزائیں (حدود و قصاص) مقرر ہیں۔ مثلاً چور کا ہاتھ کاٹنا یا قاتل سے قصاص لینا۔ اگر حکومت نہ ہو اور ہر شخص خود یہ

[1] عمید زنجانی، فقہ سیاسی، جلد ۲، صفحہ ۶۷۔

سزائیں دینے لگے تو معاشرہ انارکی کا شکار ہو جائے گا۔ ان سزاؤں کو نافذ کرنے کے لیے ایک "قاضی" اور ایک "جلاد" کی ضرورت ہے جو ریاستی مشینری کا حصہ ہوں۔

نتیجتاً احکامِ اسلام کا ابدی ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ "حکومتِ اسلامی" کی ضرورت بھی ابدی ہے، تاکہ ان احکام کو نافذ کیا جا سکے۔ امام خمینیؒ فرماتے ہیں: "کیا اسلام کے احکام صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کے لیے تھے؟ کیا آج حدود اور قصاص معطل ہو چکے ہیں؟ اگر نہیں، تو پھر ان کو نافذ کرنے والی حکومت کا ہونا بھی ضروری ہے۔"[۱]

دلیلِ سوم: انبیاء کا ہدفِ بعثت اور قیامِ قسط

قرآنِ کریم نے انبیاء کی بعثت کا ایک بنیادی مقصد معاشرے میں "انصاف" (قسط) کا قیام بتایا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۖ وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ "بتحقیق ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہو سکیں، اور ہم نے لوہا (الحدید) نازل کیا جس میں سخت جنگی قوت (بأس شدید) ہے اور لوگوں کے لیے منافع ہیں۔"[۲]

اس آیت میں عدل کے قیام کے لیے دو چیزیں بیان کی گئی ہیں:

۱. کتاب و میزان: یعنی قانون اور ضابطہ۔

---

[۱] عمید زنجانی، فقہ سیاسی، جلد ۲، صفحہ ۷۸۔

[۲] سورہ حدید: ۲۵۔

۲. الحدید (لوہا): یعنی طاقت اور قوتِ نافذہ۔

عدل و انصاف محض وعظ و نصیحت یا کتاب پڑھنے سے قائم نہیں ہوتا۔ ظالم کا ہاتھ روکنے اور مظلوم کا حق دلانے کے لیے قانون کے ساتھ "طاقت" کا ہونا ضروری ہے۔ "لوہا" یہاں حکومتی طاقت، تلوار اور اسلحے کی علامت ہے۔ انبیاء صرف مسئلہ بتانے نہیں آئے تھے، بلکہ وہ اس لیے آئے تھے کہ "کتاب" (قانون) کو "لوہے" (حکومت) کی طاقت سے نافذ کریں اور معاشرے میں عملی طور پر انصاف قائم کریں۔[1]

دلیلِ چہارم: وحدتِ امت اور "نفیٔ سبیل"

اسلام مسلمانوں کی وحدت اور سیاسی آزادی پر بہت زور دیتا ہے۔ قرآن کا ایک اٹل قانون ہے جسے فقہاء "قاعدہ نفیِ سبیل" کہتے ہیں: ﴿وَلَن يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا﴾ "اور اللہ نے کافروں کے لیے مومنین پر (غلبے کا) ہرگز کوئی راستہ نہیں رکھا۔"[2]

اس آیت کا تقاضا ہے کہ مسلمان کبھی بھی کفار کے سیاسی، معاشی یا عسکری تسلط کے نیچے نہ رہیں۔

آج کی دنیا میں استعماری طاقتیں مسلمانوں کو تقسیم کرنے اور ان کے وسائل پر قبضہ کرنے کے درپے ہیں۔ ایسے حالات میں مسلمانوں کی آزادی، ان کی عزتِ نفس (سیادت) اور کفار کے تسلط سے نجات اس وقت تک ممکن نہیں جب تک مسلمان اپنی سیاسی قوت مجتمع کر کے ایک "مقتدر اسلامی حکومت" قائم نہ کریں۔ ایک کمزور اور بکھرا ہوا معاشرہ کبھی بھی "نفیٔ سبیل" پر عمل نہیں کر سکتا۔ یہ کام صرف ایک طاقتور اسلامی ریاست ہی کر سکتی ہے جو عالمِ کفر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکے۔ لہٰذا، مسلمانوں کی آزادی اور

---

[1] حمید رضا اشراقی، فلسفہ و اہدافِ حکومتِ اسلامی، صفحہ ۹۲ تا ۱۱۳۔

[2] سورہ نساء: ۱۴۱۔

عزت کے تحفظ کے لیے حکومت کا قیام "واجب" ہے۔[۱]

دلیلِ پنجم: سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور سنتِ عملی

سب سے بڑی اور عملی دلیل خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ اور سنتِ عملی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مکہ سے مدینہ ہجرت فرماتے ہی محض مسجد تعمیر نہیں کی، بلکہ ایک باقاعدہ "ریاست" کی بنیاد رکھی۔ آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے درج ذیل اقدامات اس بات کا ثبوت ہیں کہ آپ نبی ہونے کے ساتھ ساتھ "حاکمِ وقت" بھی تھے:

۱. تقرریاں: آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مختلف علاقوں (جیسے یمن، مکہ) میں گورنر (والی) بھیجے۔

۲. قضاء: آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے لوگوں کے جھگڑے چکانے کے لیے قاضی (جج) مقرر کیے۔

۳. محاصل: آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے زکوٰۃ اور صدقات وصول کرنے کے لیے عاملین (Tax Collectors) تعینات کیے۔

۴. دفاع: آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فوجیں ترتیب دیں، لشکر روانہ کیے اور خود جنگوں کی کمانڈ کی۔

۵. خارجہ پالیسی: آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے دیگر ریاستوں (قیصر و کسریٰ) کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کیے اور معاہدے کیے۔

اگر حکومت بنانا اور سیاست کرنا "دین" کا حصہ نہ ہوتا، تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اپنی مبارک زندگی کا اتنا بڑا حصہ اور اپنی توانائیاں اس کام میں صرف نہ کرتے۔ آپ کا عمل اس بات کی دلیل ہے کہ اسلامی نظامِ حکومت

---

[۱] عمید زنجانی، فقہ سیاسی، جلد ۲، صفحہ ۷۹، ۸۰۔

کا قیام سنتِ مؤکدہ ہے۔[۱]

دلیلِ ششم: امیرالمومنین علی علیہ السلام کا استدلال

تاریخِ اسلام میں ایک گروہ (خوارج) ایسا پیدا ہوا جس نے حکومت کی ضرورت کا انکار کیا اور نعرہ لگایا: "لَا حُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ" حکومت صرف اللہ کی ہے، ہمیں کسی انسانی حاکم کی ضرورت نہیں۔ یہ نعرہ در حقیقت ایک طرح کا "مذہبی انارکسزم" تھا۔

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام نے اس فکری مغالطے کا جواب دیتے ہوئے فرمایا: "كَلِمَةُ حَقٍّ يُرَادُ بِهَا بَاطِلٌ! نَعَمْ إِنَّهُ لَا حُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ، وَلَكِنَّ هَؤُلَاءِ يَقُولُونَ لَا إِمْرَةَ إِلَّا لِلَّهِ، وَإِنَّهُ لَا بُدَّ لِلنَّاسِ مِنْ أَمِيرٍ بَرٍّ أَوْ فَاجِرٍ" "یہ بات (لاحکم الا اللہ) حق ہے، لیکن اس سے جو مطلب یہ (خوارج) لے رہے ہیں وہ باطل ہے! جی ہاں، حکم (قانون سازی) صرف اللہ کا ہے، لیکن یہ لوگ کہتے ہیں کہ "امارت" (حکومت/ایگزیکٹو) بھی صرف اللہ کی ہوگی (کوئی انسان امیر نہیں ہو سکتا)۔ حالانکہ لوگوں کے لیے ایک حاکم (امیر) کا ہونا ناگزیر ہے، خواہ وہ نیک ہو یا بد۔"[۲]

امام علی علیہ السلام نے یہاں واضح فرق کیا کہ "قانون" اللہ کا ہوگا، لیکن اس قانون کو نافذ کرنے والا "حاکم" انسانوں میں سے ہونا ضروری ہے۔ آپؑ نے فرمایا کہ حکومت اتنی بڑی ضرورت ہے کہ اگر عادل حکومت میسر نہ ہو تو "ہرج و مرج" اور خونریزی سے بچنے کے لیے فاجر حکومت بھی گوارا کی جا سکتی ہے، لیکن "بے حکومتی" (Anarchy) کسی صورت قابلِ قبول نہیں۔ یہ دلیل ثابت کرتی ہے کہ اہل بیت علیہم السلام کے نزدیک حکومت کا وجود معاشرے کی بقا کے لیے لازمی ہے۔

---

[۱] عمید زنجانی، فقہ سیاسی، جلد ۲، صفحہ ۸۱۔

[۲] نہج البلاغہ، خطبہ ۴۰۔

ان تمام دلائل کا نچوڑ یہ ہے کہ اسلام محض مسجد تک محدود دین نہیں، بلکہ یہ پارلیمنٹ، عدالت اور بازار کا دین بھی ہے۔ اللہ کے احکام (حدود، قصاص، جہاد، زکوٰۃ) کا نفاذ اور امتِ مسلمہ کی عزت و آبرو کا تحفظ اس وقت تک ناممکن ہے جب تک ایک "اسلامی حکومت" کا ڈھانچہ موجود نہ ہو۔

یہی وہ شرعی ضرورت ہے جو زمانۂ غیبت میں "ولایتِ فقیہ" کے نظریے کی بنیاد بنتی ہے، تاکہ دین معطل نہ ہو بلکہ جاری و ساری رہے۔

دین اور سیاست کا ربط

اسلامی نظامِ فکر کا سب سے بنیادی امتیاز اس کا "توحیدی مزاج" ہے۔ یہ توحید صرف ذاتِ باری تعالیٰ تک محدود نہیں، بلکہ یہ انسانی زندگی کے تمام شعبوں کا احاطہ کرتی ہے۔ اسلام میں زندگی خانوں میں بٹا ہوا کوئی تصور نہیں ہے کہ مسجد میں خدا کی حکمرانی ہو اور بازار و ایوانِ اقتدار میں قیصر و کسریٰ کی۔ ہماری نظر میں دینِ حقیقی اور سیاستِ صحیحہ کے درمیان ایک "نامیاتی" (Organic) اور "ناقابلِ انفکاک" (Inseparable) تعلق ہے۔

ان دونوں کے باہمی ربط کی مثال "جسم اور روح" یا "درخت اور پانی" جیسی ہے۔ دین اگر ایک تناور درخت ہے، تو سیاست (حکومت و اقتدار) اس کے لیے پانی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر درخت کو پانی سے محروم کر دیا جائے تو وہ خشک ہو کر ایندھن تو بن سکتا ہے، سایہ دار شجر نہیں۔ اسی طرح اگر سیاست دین کے تابع نہ ہو، تو وہ ایسا سیلاب ہے جو کھیتیوں کو سیراب کرنے کے بجائے برباد کر دیتا ہے۔ "جدائیِ دین و سیاست" کا نظریہ درحقیقت اسلام کو اس کی روح سے خالی کر دینے کی ایک گہری سازش ہے۔ شہید مدرسؒ کا یہ تاریخی اور زریں جملہ اسلامی سیاسیات کا بنیادی اصول ہے: "دِيَانَتُنَا عَيْنُ سِيَاسَتِنَا ، وَ

سِیَاسَتُنَا عَیْنُ دِیَانَتِنَا"[۱] "ہماری دیانت ہماری سیاست ہے، اور ہماری سیاست ہماری دیانت ہے۔"[۲]

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ذہن میں یہ سوال کیوں پیدا ہوا کہ دین کو سیاست سے الگ ہونا چاہیے؟ یہ دراصل مغرب کا درآمد شدہ فکری کینسر ہے۔ یورپ میں قرونِ وسطٰی کے دوران کلیسا کے پادریوں نے مذہب کے نام پر بدترین آمریت قائم کر رکھی تھی۔ وہ سائنس، عقل اور ترقی کے دشمن تھے اور "تفتیشِ عقائد" کی عدالتوں کے ذریعے لوگوں کو زندہ جلا دیتے تھے۔ اس ظلم کے ردِ عمل میں وہاں مذہب بیزاری کی تحریک چلی اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ "چرچ" اور "ریاست" کو الگ کر دیا جائے۔

مغرب کے لیے شاید یہ فیصلہ درست رہا ہو (کیونکہ عیسائیت کے پاس کوئی سیاسی نظام نہیں تھا)، لیکن استعماری طاقتوں نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اس "مسیحی تجربے" کو عالمِ اسلام پر تھوپنے کی کوشش کی۔ انہوں نے یہ پروپیگنڈا کیا کہ اگر مسلمانوں کو ترقی کرنی ہے تو انہیں بھی اسلام کو مسجد تک محدود کرنا ہوگا۔ بیسویں صدی میں سامراجی ایجنڈے کے تحت تین کرداروں کو عالمِ اسلام میں مسلط کیا گیا تاکہ وہ بزورِ قوت دین اور سیاست میں تفریق ڈال سکیں:

---

[۱] یہ تاریخی اور مشہور جملہ **شہید آیت اللہ سید حسن مدرس** (رح) کا ہے۔ عربی متن: "دِیَانَتُنَا عَیْنُ سِیَاسَتِنَا، وَ سِیَاسَتُنَا عَیْنُ دِیَانَتِنَا" "ہماری دیانت (دین) عین ہماری سیاست ہے، اور ہماری سیاست عین ہماری دیانت ہے۔" عام طور پر اسے یوں نقل کیا جاتا ہے: "دیانت ما عین سیاست ماست و سیاست ما عین دیانت ماست" اور بعض نقلوں میں ترتیب یا تعبیر میں معمولی تفاوت پایا جاتا ہے۔ سید حسن مدرس ایران کے ایک عظیم انقلابی عالم اور رکن پارلیمنٹ تھے جنھوں نے رضا شاہ پہلوی کی ڈکٹیٹرشپ کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔ آپ کا یہ نظریہ تھا کہ اسلام میں دین اور سیاست دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں (سیکولرازم کی نفی)۔ بعد میں امام خمینیؒ نے اس جملے کو اپنے انقلابی منشور کی بنیاد بنایا، جس کی وجہ سے اکثر لوگ اسے امام خمینیؒ سے منسوب کر دیتے ہیں، لیکن اصل خالق سید حسن مدرس ہیں۔

[۲] خمینیؒ، صحیفہ نور، جلد ۱۳، صفحہ ۲۱۷۔

۱. ترکی میں مصطفیٰ کمال اتاترک: جس نے خلافت کا خاتمہ کیا اور لادینیت (Laïcité) کو سرکاری مذہب بنا دیا۔

۲. ایران میں رضا شاہ پہلوی: جس نے عزاداری پر پابندی لگائی اور علماء کے عمامے اتروائے۔

۳. افغانستان میں امان اللہ خان: جس نے مغربی تہذیب کی اندھی تقلید کی۔

ان اقدامات کا مقصد صرف ایک تھا: اسلام کی اس "سیاسی طاقت" کو ختم کرنا جو استعمار کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔[۱]

یہ غلط فہمی اس لیے بھی پیدا ہوتی ہے کہ ہم "سیاست" کا مفہوم مغربی لغت سے لیتے ہیں۔ مغرب میں سیاست (Politics) کا مطلب "میکیاویلین" طرزِ عمل ہے، یعنی اقتدار کے لیے جھوٹ، فریب، اور سازش کا استعمال۔ جبکہ عربی اور اسلامی لغت میں "سیاست" کا مفہوم انتہائی پاکیزہ ہے۔

لغت کی مستند کتاب "مجمع البحرین" میں طریحی لکھتے ہیں: "السِّيَاسَةُ الْقِيَامُ عَلَى الشَّيْءِ بِمَا يُصْلِحُهُ" "سیاست کا مطلب ہے کسی شے کی نگہداشت اور تدبیر اس انداز میں کرنا جو اس کی اصلاح کا باعث ہو۔"[۲]

یہی وجہ ہے کہ احادیث میں انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کو "سائس" (سیاستدان) کہا گیا ہے۔ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: كَانَتْ بَنُو إِسْرَائِيلَ تَسُوسُهُمُ الْأَنْبِيَاءُ؛ "بنی اسرائیل کے

---

[۱] سید صادق؛ گونہ شناسی ارتباط دین وسیاست در اندیشہ سیاسی شیعہ، صفحہ ۴ تا ۳۲۔

[۲] طریحی، مجمع البحرین، مادہ: سوس۔

امور کی سیاست (قیادت و تدبیر) ان کے انبیاء کیا کرتے تھے۔"[۱]

نیز زیارتِ جامعہ کبیرہ میں ہم ائمہ اہلبیت علیہم السلام کو ان الفاظ میں سلام کرتے ہیں: وَ سَاسَةَ الْعِبَادِ "اے اللہ کے بندوں کی سیاست (تدبیر و تربیت) کرنے والو!"۔

پس اسلام میں سیاست کا مطلب "اقتدار کی ہوس" نہیں، بلکہ یہ "فنِ ہدایت"، "انتظامِ معاشرہ" اور "عوام کی فلاح و بہبود" کا نام ہے۔

ایک محقق کو ان دو تصورات میں خطِ امتیاز کھینچنا ہوگا۔ ایک وہ سیاست ہے جو آج کل رائج ہے (دھوکہ، کرپشن، لوٹ مار) اور ایک وہ سیاست ہے جو انبیاء علیہم السلام کا شیوہ تھی۔

امام خمینیؒ نے اس حوالے سے اپنا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ جب وہ قید تھے تو "ساواک" (شاہ کی خفیہ پولیس) کے سربراہ نے ان سے کہا:

"آقا! سیاست تو جھوٹ، فریب اور پدر سوختگی (خباثت) کا نام ہے، آپ علماء خود کو اس گندگی سے کیوں آلودہ کرتے ہیں؟ یہ کام ہم پر چھوڑ دیں۔"

امام خمینیؒ نے بصیرت افروز جواب دیا: "جس سیاست (شیطانی) کی تم بات کر رہے ہو، وہ یقیناً ہماری نہیں ہے، وہ تمہیں مبارک ہو۔ لیکن وہ سیاست جس کا مقصد معاشرے کی ہدایت اور عدل کا قیام ہے، وہ ہمارا (انبیاء و علماء کا) اصل وظیفہ ہے۔"[۲]

اس کی سب سے بڑی تاریخی مثال امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام اور معاویہ کا تقابل ہے۔ لوگ سمجھتے تھے کہ معاویہ زیادہ بڑا سیاستدان ہے کیونکہ وہ جوڑ توڑ کا ماہر تھا۔ حضرت علی علیہ السلام نے اس غلط فہمی کا ازالہ کرتے

---

[۱] بیہقی، دلائل النبوۃ، جلد ۶، صفحہ ۳۳۸۔

[۲] خمینیؒ، صحیفہ نور، جلد ۱۳، صفحہ ۲۱۶۔

ہوئے فرمایا: وَاللّٰہِ مَا مُعَاوِيَةُ بِأَدْهَى مِنِّي ، وَلَكِنَّهُ يَغْدِرُ وَيَفْجُرُ؛ "خدا کی قسم! معاویہ مجھ سے زیادہ ہوشیار (سیاستدان) نہیں ہے، لیکن وہ مکر کرتا ہے اور گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے۔ (اگر مجھے تقویٰ کا پاس نہ ہوتا تو میں سب سے بڑا شاطر ہوتا۔"[1]

معلوم ہوا کہ اسلام "اخلاقی سیاست" کا علمبردار ہے، نہ کہ "میکیاویلین سیاست" کا۔[2]

اگر کوئی شخص قرآن و سنت اور فقہ کی کتابوں کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کرے تو اسے اعتراف کرنا پڑے گا کہ اسلام کا ۸۰ فیصد حصہ "سیاسیات و معاملات" سے متعلق ہے اور بہت کم حصہ انفرادی عبادات پر مشتمل ہے۔

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۲۰۰۔

[2] یہ اصطلاح مشہور اطالوی مفکر نکولو میکیاویلی (Niccolò Machiavelli) اور اس کی متنازعہ کتاب "دی پرنس" (The Prince) سے منسوب ہے۔ سیاسیات میں یہ نظریہ "موقع پرستی"، "عیاری" اور "اخلاقیات سے عاری سیاست" کا دوسرا نام ہے۔ اس کے بنیادی اصول یہ ہیں: ۱. مقصد ذرائع کا جواز ہے (The ends justify the means) یہ میکیاویلین سیاست کا سب سے بڑا نعرہ ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اگر حکمران کا مقصد اقتدار کو بچانا یا ریاست کو مضبوط کرنا ہے، تو اس کے لیے وہ کوئی بھی راستہ اختیار کر سکتا ہے، چاہے وہ راستہ غیر اخلاقی، ظالمانہ یا جھوٹ پر مبنی ہی کیوں نہ ہو۔ ۲. سیاست اور اخلاق کی علیحدگی (Separation of Politics and Ethics) میکیاویلی کا کہنا تھا کہ سیاست میں اخلاقیات (سچ، رحم، ایمانداری) ایک رکاوٹ ہیں۔ ایک حکمران کو کامیاب ہونے کے لیے اخلاقی اقدار کو پامال کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ ۳. شیر اور لومڑی کی مثال: میکیاویلی کے مطابق حکمران کے اندر دو جانوروں کی خصوصیات ہونی چاہئیں: شیر: تاکہ وہ دشمنوں کو اپنی طاقت سے ڈرا سکے۔ لومڑی: تاکہ وہ چالاکی سے جالوں اور سازشوں کو سمجھ سکے اور دھوکہ دے سکے۔ ۴. محبت سے بہتر خوف ہے
اس نظریے کے مطابق، عوام کا حکمران سے محبت کرنا اتنا اہم نہیں جتنا ان کا حکمران سے ڈرنا ضروری ہے۔ اگر حکمران کو محبت اور خوف میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہو، تو اسے خوف کا انتخاب کرنا چاہیے تاکہ اس کی گرفت مضبوط رہے۔ ۵. منافقت کا جواز میکیاویلی مشورہ دیتا ہے کہ حکمران کو "ظاہری طور پر" بہت نیک، مذہبی اور رحم دل نظر آنا چاہیے، لیکن اندر سے اسے ضرورت پڑنے پر بے رحم ہونے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ جبکہ اس کے مدمقابل "نظامِ ولایت" ہے، جو اقتدار کو امانتِ الٰہی سمجھتا ہے۔

امام خمینیؒ فرماتے ہیں: "واللہ! اسلام تمام کا تمام سیاست ہے، اسے غلط متعارف کروایا گیا ہے۔ اسلام کے احکام پر غور کریں۔ نمازِ جمعہ اور حج کیا ہیں؟ یہ سیاسی اجتماعات ہیں۔ خمس و زکوٰۃ کیا ہیں؟ یہ ریاستی ٹیکس ہیں۔ جہاد اور امر بالمعروف کیا ہیں؟ یہ ریاستی نظام ہیں۔"[1]

فقہ کے ابواب کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱. عبادات: (نماز، روزہ) جو انسان کا خدا سے تعلق ہے۔

۲. معاملات: (تجارت، نکاح، طلاق) جو سماجی تعلقات ہیں۔

۳. سیاسیات: (حدود، قصاص، دیات، جہاد، خراج) جو حکومتی تعلقات ہیں۔

غور کریں تو عبادات اور معاملات بھی حکومت کے بغیر نامکمل ہیں۔ حج جیسا عظیم رکنِ اسلام "امیرِ حج" (حکومتی نمائندے) کے بغیر ادا نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح تجارت کے قوانین سود اور احتکار (ذخیرہ اندوزی) کی ممانعت کے بغیر بے معنی ہیں، اور ان ممنوعات کو روکنا صرف حکومت کے بس میں ہے۔ لہٰذا جو شخص دین کو سیاست سے جدا کرتا ہے، وہ درحقیقت دین کے ایک بڑے حصے کا انکار کرتا ہے۔

شیعہ مکتبِ فکر میں "غدیر" کا واقعہ دین اور سیاست کے ربط کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غدیر کے میدان میں حضرت علی علیہ السلام کو محض "مسئلہ بتانے والا" مقرر نہیں کیا تھا، بلکہ "مَن کُنتُ مَولَاہُ" کہہ کر انہیں امت کا "سیاسی اور روحانی حاکم اور مولا" نامزد کیا تھا۔

اگر دین صرف نماز روزے کا نام ہوتا تو اللہ تعالیٰ یہ نہ فرماتا کہ: ﴿وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ﴾ "(اے نبیؐ!) اگر آپ نے یہ (ولایت و امامت کا) پیغام نہ پہنچایا تو گویا آپ نے رسالت کا کوئی

[1] خمینیؒ، صحیفہ نور، جلد ۲۱، صفحہ ۹۸۔

کام ہی نہیں کیا۔"[1]

اس آیت سے معلوم ہوا کہ "نظامِ حکومت و امامت" کا تعین اتنا اہم ہے کہ اس کے بغیر باقی ساری نبوت ادھوری ہے۔ پس جو لوگ سیاست کو دین سے الگ سمجھتے ہیں، وہ در حقیقت "غدیر" کے فلسفے کے منکر ہیں۔

سیاست کو دین سے نکال دیا جائے تو دین ایک "بے جان ڈھانچہ" رہ جاتا ہے جو ظالموں کے ہاتھ میں کھلونا بن سکتا ہے۔ اسلام نے سیاست کو عبادت گاہ کے محراب سے جوڑ کر اسے "تقدس" عطا کیا ہے۔ اسلامی سیاست کا مقصد اقتدار کی کرسی نہیں، بلکہ انسانیت کی خدمت اور کلمۃ اللہ کی سربلندی ہے۔ "نظامِ ولایتِ فقیہ" اسی مقدس سیاست کا تسلسل ہے جو عصرِ غیبت میں دین کی حاکمیت کو یقینی بناتا ہے۔

اسلامی حکومت کے اہداف اور ماہیت

ا۔ مقصدیت اور نوعیت کا تعین

جب کسی سیاسی نظام کی بنیاد رکھی جاتی ہے، تو اس کے معماروں کے پیشِ نظر دو بنیادی سوال ہوتے ہیں: پہلا یہ کہ اس حکومت کا "ہدفِ غائی" (Ultimate Goal) کیا ہے؟ یعنی یہ کاروانِ انسانیت کو کس منزل پر پہنچانا چاہتی ہے؟ اور دوسرا یہ کہ اس حکومت کی "ماہیت" (Nature) کیا ہے؟ یعنی حکمران اور عوام کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ کیا یہ تعلق "آقا اور غلام" کا ہے، "وکیل اور مؤکل" کا ہے، یا "ولی اور مولیٰ علیہ" کا ہے؟

جدید سیکولر جمہوریتوں میں حکومت کا ہدف صرف "مادی فلاح و بہبود"، آزادی اور امنیت تک محدود ہوتا

[1] سورہ مائدہ: ۶۷۔

ہے۔ ان کے نزدیک انسان کا پیٹ بھر جائے اور وہ اپنی خواہشات کی تکمیل میں آزاد ہو، یہی معراجِ کمال ہے۔ لیکن اسلام، جو انسان کو ایک ابدی اور روحانی مخلوق سمجھتا ہے، اس کے سیاسی اہداف اس سے کہیں بلند اور ارفع ہیں۔ اسلام میں حکومت، روٹی کپڑے سے شروع ہو کر "خلیفۃ اللہ" کے مقام تک پہنچنے کا زینہ ہے۔

۲۔ اسلامی حکومت کے اہداف

قرآنِ کریم اور سنتِ معصومین علیہم السلام کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت کے مقاصد کو دو درجات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: ایک "ہدفِ متوسط" اور دوسرا "ہدفِ نہائی"۔

(الف) ہدفِ متوسط: قیامِ قسط و عدل اور مدینہ فاضلہ

یہ وہ ہدف ہے جو تمام انبیاء کی بعثت کا مشترک سماجی ایجنڈا رہا ہے۔ قرآنِ کریم ارشاد فرماتا ہے: ﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ "بتحقیق ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان (ترازو) نازل کی تاکہ لوگ انصاف (قسط) پر قائم ہو سکیں۔"[1]

اسلامی حکومت کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ زمین پر ایک ایسا "مدینہ فاضلہ" (Ideal Society) تشکیل دے جہاں:

۱. معاشی عدل ہو: دولت چند ہاتھوں میں گردش نہ کرے (كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ) بلکہ اس کا بہاؤ غریبوں کی طرف ہو۔ کوئی بھوکا نہ سوئے اور کوئی امیر

[1] سورہ حدید: ۲۵۔

استحصالی نہ بنے۔

۲. قانونی مساوات ہو: قانون کی نظر میں شاہ و گدا برابر ہوں۔ طاقتور کمزور کو دبا نہ سکے۔

۳. امنیت اور خوشحالی ہو: جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی: ﴿رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَدًا آمِنًا وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ﴾ "اے پروردگار! اس شہر کو امن والا بنا دے اور اس کے رہنے والوں کو پھلوں (وسائل) کا رزق عطا کر۔"[1]

یہ تمام امور (امن، معیشت، عدل) حکومت کے "مقدماتی اہداف" ہیں۔ یعنی یہ بذاتِ خود آخری منزل نہیں ہیں، بلکہ یہ "راستہ ہموار کرنے" کے لیے ہیں تاکہ انسان یکسوئی کے ساتھ اپنے اصل مقصد کی طرف بڑھ سکے۔[2]

(ب) ہدفِ نہائی: انسان کی نورانیت اور مقامِ خلافتِ الٰہی

یہ وہ امتیاز ہے جو اسلامی سیاست کو دنیا کے تمام نظاموں سے ممتاز کرتا ہے۔ سیکولر حکومتوں کا کام یہیں ختم ہو جاتا ہے کہ شہری کو روٹی اور آزادی مل گئی، لیکن اسلامی حکومت کا اصل کام یہاں سے شروع ہوتا ہے۔ اس کا حتمی ہدف انسان کو "ظلمات" (جہالت و مادہ پرستی) سے نکال کر "نور" (معرفتِ الٰہی) کی طرف لانا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ﴾ "اللہ صاحبانِ ایمان کا ولی ہے، وہ انہیں (کفر و جہالت کی) تاریکیوں سے نکال کر (ایمان و معرفت کے)

[1] سورہ بقرہ: ۱۲۶۔

[2] حمید رضا اشراقی، فلسفہ و اہدافِ حکومتِ اسلامی، صفحہ ۹۲ تا ۱۱۳۔

نور کی طرف لاتا ہے۔"[۱]

اسلامی حکومت کا مقصد یہ ہے کہ وہ ایسا ماحول، تعلیمی نظام اور ثقافت فراہم کرے جس میں انسان کی روحانی صلاحیتیں پروان چڑھیں۔ جس طرح جسم کی صحت روح کی بقا کے لیے ضروری ہے، اسی طرح "عادلانہ نظام" (جسم) اس لیے ضروری ہے تاکہ اس میں بسنے والا انسان "انسانِ کامل" اور "خلیفۃ اللہ" (روح) بن سکے۔

اگر ایک حکومت عوام کو پیٹ بھر کر کھانا تو دے، لیکن انہیں شراب، فحاشی اور خدا فراموشی کی آزادی دے دے (جیسا کہ مغرب میں ہے)، تو اسلامی نقطہ نظر سے وہ حکومت "فیل" (Fail) ہے، کیونکہ اس نے انسان کو جانور تو اچھا بنا دیا لیکن انسان نہیں رہنے دیا۔ اسلامی ریاست کا ہدف انسان کا "تزکیہ" ہے:
﴿وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾[۲]۔[۳]

۳۔ اسلامی حکومت کی ماہیت: ولایت یا وکالت؟

اب ہم اس سوال کی طرف آتے ہیں کہ اس حکومت کی "جنس" اور "نیچر" کیا ہے؟ جدید سیاسیات میں حکومت کو ایک "سوشل کنٹریکٹ" (عمرانی معاہدہ) سمجھا جاتا ہے جس میں حکمران عوام کا "وکیل" (Agent) ہوتا ہے۔ کیا اسلام میں بھی ایسا ہی ہے؟

(الف) وکالت اور ولایت کا فرق

اسلامی نظام میں حکمرانی کی ماہیت "وکالت" نہیں، بلکہ "ولایت" ہے۔ ان دونوں میں زمین آسمان کا

---

[۱] سورہ بقرہ: ۲۵۷۔

[۲] سورۂ جمعہ آیت ۲۔

[۳] حمید رضا اشراقی، فلسفہ و اہدافِ حکومتِ اسلامی، صفحہ ۹۲ تا ۱۱۳۔

فرق ہے:

- وکالت: وکیل اپنے مؤکل (Client) کی مرضی کا تابع ہوتا ہے۔ اگر مؤکل کہے کہ "شراب بیچو"، تو وکیل انکار نہیں کر سکتا۔ مغربی جمہوریت میں حکمران عوام کے "وکیل" ہیں، لہٰذا اگر عوام کی اکثریت ہم جنس پرستی یا سود کو جائز قرار دے، تو حکمران اسے قانون بنانے پر مجبور ہیں۔
- ولایت: ولی کا کام مولیٰ علیہ (جس پر ولایت ہو) کی "مصلحت" دیکھنا ہے، نہ کہ اس کی "خواہش"۔ جیسے باپ اپنے بچے کا ولی ہے۔ اگر بیمار بچہ مٹھائی مانگے اور باپ اسے کڑوی دوا دے، تو یہ باپ کی محبت ہے، ظلم نہیں۔ اسلامی حکومت "ولایت" ہے کیونکہ یہ عوام کی محض "خواہشات" (جو غلط بھی ہو سکتی ہیں) کی پیروی نہیں کرتی، بلکہ ان کی حقیقی "مصلحت" (جو اللہ کے قانون میں ہے) کو نافذ کرتی ہے۔[1]

(ب) حاکمیتِ الٰہیہ

اسلامی حکومت کی ماہیت کی بنیاد "توحیدِ ربوبی" پر ہے۔ کائنات کا حقیقی مالک صرف اللہ ہے۔ کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکم چلانے کا ذاتی حق نہیں ہے۔ ﴿إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ﴾ "حکم (حکومت) صرف اللہ کے لیے ہے۔"[2]

لہٰذا، اسلامی ریاست میں حکمران کی مشروعیت کا منبع "عوام کا ووٹ" نہیں، بلکہ "اللہ کا اذن" ہے۔ حکمران اس لیے حکمران ہے کیونکہ اللہ نے (رسولؐ یا امامؑ کے ذریعے) اسے یہ حق دیا ہے۔ اگر اللہ کا اذن

---

[1] شہید مطہری، یادداشت ہا، جلد ۵، صفحہ ۲۹۲۔
[2] سورہ یوسف: ۴۰۔

نہ ہو، تو چاہے پوری دنیا ووٹ دیدے، وہ حکومت شرعی نہیں ہو سکتی (جیسے فرعون یا نمرود کی حکومت)۔

(ج) عوامی کردار: مقبولیت بمقابلہ مشروعیت

یہاں ایک اہم مغالطے کا ازالہ ضروری ہے۔ "الٰہی ماہیت" کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ عوام کا کوئی کردار نہیں۔ شہید مطہریؒ اور دیگر محققین کے مطابق، اسلامی حکومت "اللہ کے اذن" اور "عوام کی بیعت" کے امتزاج سے بنتی ہے۔

- مشروعیت: یعنی حکومت کرنے کا "حق"۔ یہ اللہ کی طرف سے آتا ہے (اہلیت اور تقویٰ کی شرط کے ساتھ)۔
- مقبولیت: یعنی حکومت کرنے کی "طاقت"۔ یہ عوام کی تائید سے آتی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام اللہ کی طرف سے "امام" اور "ولی" تھے، لیکن آپ نے حکومت تب سنبھالی جب عوام نے بیعت کی۔ عوام نے انہیں "امام" نہیں بنایا (وہ تو اللہ نے بنایا تھا)، بلکہ عوام نے انہیں "اقتدار" تک پہنچایا۔ اسلامی حکومت کی ماہیت یہ ہے کہ یہ "عوام پر" نہیں، بلکہ "عوام کے ساتھ" اللہ کا حکم نافذ کرتی ہے۔ یہ آمریت نہیں کیونکہ حاکم قانونِ الٰہی کا پابند ہے، اور یہ مغربی جمہوریت نہیں کیونکہ قانون سازی میں اللہ کی مرضی مقدم ہے۔[1]

(د) امانت اور ذمہ داری

آخر میں، اسلامی حکومت کی ایک اہم ماہیت یہ ہے کہ یہ کوئی "استحقاق" یا لوٹ مار کا ذریعہ نہیں، بلکہ ایک بھاری "امانت" ہے۔

---

[1] سید جواد ورعی، ماہیتِ حکومتِ اسلامی، صفحہ ۶۱ تا ۸۱۔

حضرت علی علیہ السلام نے اپنے گورنر اشعث بن قیس کو لکھا: "وَ إِنَّ عَمَلَكَ لَيْسَ لَكَ بِطُعْمَةٍ وَ لَكِنَّهُ فِي عُنُقِكَ أَمَانَةٌ"؛ "یہ حکومتی عہدہ تمہارے لیے کوئی نوالہ نہیں جسے تم کھا جاؤ، بلکہ یہ تمہاری گردن میں ایک امانت ہے۔"[۱]

یہی وجہ ہے کہ اسلامی ریاست میں عہدے مانگے نہیں جاتے، بلکہ اہل افراد کو ڈھونڈ کر دیے جاتے ہیں، اور حکمران ہر لمحہ اللہ اور عوام کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے۔

یہ تمام مباحث "ولایتِ فقیہ" کے نظریے کے لیے ایک ٹھوس علمی زمین ہموار کرتے ہیں۔ جب یہ طے پا گیا کہ حکومت ضروری ہے، دین و سیاست ایک ہیں، اور حکومت کی ماہیت "ولایت" ہے، تو اب اگلا منطقی سوال یہ ہے کہ تاریخِ اسلام میں معصومین علیہم السلام نے اس "ولایت" کو کس طرح عملی جامہ پہنایا؟ یہ بحث ہم اگلے باب میں کریں گے۔

[۱] نہج البلاغہ، مکتوب ۵۔

باب دوم: اسلامی حکومت کے تاریخی نمونے (عہدِ معصومین علیہم السلام)

مکتبِ تشیع میں امامت کا تصور اور اس کے سیاسی پہلو

۱۔ امامت؛ عقیدہ یا نظام؟

مکتبِ تشیع میں "امامت" محض ایک عقیدہ یا فروعی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ یہ دین کی اساس اور شریعت کا بنیادی ستون ہے۔ شیعہ نقطۂ نظر سے امامت کی تعریف صرف یہ نہیں کہ امام نماز پڑھائے یا مسائل بتائے، بلکہ امامت کا مفہوم بالعموم "دین و دنیا کی جامع قیادت" "الرئاسة العامة فی امور الدین و الدنیا" ہے۔ یہ قیادت بیک وقت "روحانی" بھی ہے اور "سیاسی" بھی۔ تاریخِ اسلام کے مطالعے سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ شیعہ نے ہمیشہ امام کو صرف ایک پیشوا نہیں سمجھا، بلکہ اسے "حاکمِ برحق" مانا ہے، جس کا حقِ حکمرانی وقت کے طواغیت نے غصب کر رکھا تھا۔

شیعہ فکر میں "دین" اور "حکومت" کا تعلق جسم اور روح جیسا ہے۔ جس طرح روح کے بغیر جسم مردہ ہے، اسی طرح حکومت کے بغیر دین کے احکام (حدود، قصاص، جہاد) معطل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ امام خمینیؒ نے اپنی کتاب "ولایت فقیہ" میں اسی نکتے کو اٹھایا ہے کہ ولایت فقیہ کا تصور دراصل نظریہ امامت ہی کی ایک توسیع ہے جو زمانہ غیبت میں دین کے نفاذ کو یقینی بناتی ہے۔ زیرِ نظر بیان میں ہم مکتبِ تشیع کے بنیادی نصوص اور تاریخی شواہد کی روشنی میں امامت کے اس سیاسی پہلو کا جائزہ لیں گے۔ [1]

---

[1] محمد ہادی معرفت، ولایت فقیہ، صفحہ ۲۸۔

۲۔ رسالت اور زعامت کا باہمی تعلق

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی اس حقیقت کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ اسلام میں "نبوت" اور "حکومت" جدا نہیں ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ میں تشریف لاتے ہی دو ایسے انقلابی اقدامات کیے جنہوں نے دنیا کی سیاسی تاریخ کا رخ موڑ دیا:

۱. امت کی تشکیل: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مختلف قبائل اور گروہوں کو "مواخات" (بھائی چارے) کے رشتے میں پرو کر ایک "امتِ واحدہ" کی بنیاد رکھی۔ یہ ایک عظیم سماجی اور سیاسی کارنامہ تھا۔

۲. ریاست کا قیام: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ میں ایک باقاعدہ "ریاست" قائم کی، جس کے سربراہ آپ خود تھے۔ آپ نے معاہدے کیے، سفیر بھیجے، جنگوں کی کمانڈ کی اور ٹیکس (زکوٰۃ) وصول کیے۔

یہ سب اعمالِ حکومت ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ اقتدار عوام کے ووٹوں کا مرہونِ منت نہیں تھا، بلکہ یہ اقتدار اللہ کی طرف سے تفویض شدہ تھا۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے: ﴿النَّبِيُّ أَوْلَى بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ﴾ "نبی مومنین کی جانوں پر خود ان سے زیادہ حق (ولایت) رکھتے ہیں۔"[1]

امام جعفر صادق علیہ السلام اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: "إِنَّ اللَّهَ أَدَّبَ نَبِيَّهُ فَأَحْسَنَ تَأْدِيبَهُ... ثُمَّ فَوَّضَ إِلَيْهِ أَمْرَ الدِّينِ وَ الْأُمَّةِ لِيَسُوسَ عِبَادَهُ" "بے شک اللہ نے اپنے نبی کی بہترین تربیت کی... پھر دین اور امت کا معاملہ ان کے سپرد (تفویض) کر دیا تاکہ وہ بندوں کی

---

[1] سورہ احزاب: ۶۔

سیاست (تدبیر و انتظام) کریں۔"[1]

اس حدیث میں "لِیَسُوسَ" (تاکہ وہ سیاست کریں) کا لفظ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا منصب صرف تلاوتِ قرآن نہیں، بلکہ "سیاستِ عباد" یعنی حکمرانی بھی تھا۔[2]

۳۔ بیعت کی حقیقت: انتخاب یا اظہارِ وفاداری؟

یہاں ایک اہم فکری مغالطے کا ازالہ ضروری ہے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا ائمہ علیہم السلام کو عوام نے منتخب کیا تھا، لہٰذا ان کی حکومت "جمہوری" تھی۔ یہ تصور درست نہیں۔ اسلامی تاریخ، بالخصوص "بیعتِ عقبہ ثانیہ" کا مطالعہ بتاتا ہے کہ بیعت کا مقصد "حاکم بنانا" نہیں تھا، بلکہ "پہلے سے موجود حاکم کی اطاعت کا عہد کرنا" تھا۔[3]

جب مدینہ کے انصار نے عقبہ کے مقام پر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی، تو یہ در حقیقت ایک "دفاعی معاہدہ" تھا۔ انصار نے کہا: "یا رسول اللہ! ہم آپ کی حفاظت اسی طرح کریں گے جیسے اپنی جان و مال اور اولاد کی کرتے ہیں۔" یہ بیعت "کشفِ حقیقت" تھی، نہ کہ "جعلِ حقیقت"۔ یعنی نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کی طرف سے حاکم مقرر ہو چکے تھے، عوام نے بیعت کر کے صرف اپنی اطاعت اور نصرت کا اعلان کیا۔

---

[1] کلینی، اصول کافی، جلد ۱، صفحہ ۲۶۶۔

[2] محمد ہادی معرفت، ولایت فقیہ، صفحہ ۲۹۔

[3] بیعتِ عقبہ ثانیہ (سن ۱۳ نبوی) اسلامی تاریخ کا وہ انقلابی معاہدہ ہے جسے مدینہ میں پہلی اسلامی ریاست کے قیام کا سنگِ بنیاد تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس موقع پر مدینہ کے ۷۵ مسلمانوں (۷۳ مرد، ۲ خواتین) نے رسول اللہ (ص) کے دستِ مبارک پر بیعت کی کہ وہ نہ صرف اسلام پر عمل کریں گے بلکہ رسول (ص) اور اسلامی نظام کے دفاع کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ اسی بیعت کے نتیجے میں ہجرتِ مدینہ واقع ہوئی اور اسلام کو ایک سیاسی قوت اور مرکز میسر آیا۔ اسے 'بیعتِ حرب' بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ باطل کے خلاف مزاحمت کا اعلان تھا۔

اسی طرح غدیر کے مقام پر مولا علی علیہ السلام کی بیعت بھی ان کی "تقرری" نہیں تھی (وہ تو اللہ نے "مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ" کے ذریعے کر دی تھی)، بلکہ یہ عوام کی طرف سے اس تقرری کی "توثیق اور قبولیت" تھی۔

لہٰذا، امامت کا منصب "انتصابی" ہے، انتخابی نہیں۔ البتہ اس منصب کے عملی نفاذ کے لیے عوامی نصرت شرط ہے۔[1]

۴۔ علی علیہ السلام کا تصورِ امامت اور شکوۂ غصب

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے اپنے پورے دورِ حیات میں کبھی بھی خلافت کو محض ایک "سیاسی عہدہ" نہیں سمجھا جسے عوام جس کو چاہیں دے دیں، بلکہ آپ نے اسے اپنا "شرعی اور موروثی حق" قرار دیا۔ خطبہ شقشقیہ میں آپؑ کا درد بھرا لہجہ ملاحظہ ہو: "أَرَى تُرَاثِي نَهْبًا" "میں اپنی میراث کو لٹتا ہوا دیکھ رہا تھا۔"[2]

یہاں لفظ "تراث" (میراث) انتہائی معنی خیز ہے۔ آپ فرما رہے ہیں کہ حکومتِ اسلامی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چھوڑی ہوئی وہ میراث تھی جس کے وارث صرف اہلبیت علیہم السلام تھے۔ آپ نے کبھی یہ نہیں کہا کہ "لوگوں نے مجھے ووٹ نہیں دیا"، بلکہ آپ نے ہمیشہ یہ کہا کہ "میرا حق چھینا گیا"۔

پھر جب آپؑ کو ظاہری خلافت ملی، تب بھی آپ نے فرمایا: "الْآنَ إِذْ رَجَعَ الْحَقُّ إِلَى أَهْلِهِ وَ نُقِلَ إِلَى مُنْتَقَلِهِ" "اب حق اپنے اہل (اصل مالک) کی طرف پلٹ آیا ہے اور اپنی صحیح جگہ پر منتقل

[1] محمد ہادی معرفت، ولایت فقیہ، صفحہ ۳۰، ۳۱۔

[2] نہج البلاغہ، خطبہ ۳۔

ہو گیا ہے۔"[1]

ابن ابی الحدید معتزلی اس جملے کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ علی علیہ السلام اپنے سے پہلے والوں کو اس مقام کا اہل نہیں سمجھتے تھے۔ یہ موقف اس بات کی دلیل ہے کہ امامت ایک "الٰہی منصب" ہے جس میں انسانوں کی مداخلت جائز نہیں۔[2]

۵۔ کلامی استدلال: قاعدۂ لطف اور ضرورتِ حکومت

شیعہ علمِ کلام میں امامت کے وجوب پر "قاعدۂ لطف" سے استدلال کیا جاتا ہے۔ خواجہ نصیر الدین طوسیؒ "تجرید الاعتقاد" میں فرماتے ہیں: "الْإِمَامَةُ لُطْفٌ، فَيَجِبُ نَصْبُهُ عَلَى اللّٰهِ تَعَالَى تَحْصِيلًا لِلْغَرَضِ" "امامت ایک لطفِ الٰہی ہے، لہٰذا اللہ پر واجب ہے کہ وہ (حکمت کے تقاضے کے تحت) امام مقرر کرے تاکہ تخلیق کا مقصد حاصل ہو سکے۔"

یعنی اللہ تعالیٰ حکیم ہے۔ اس نے انسان کو پیدا کیا اور اس کی ہدایت کے لیے شریعت بھیجی۔ اب اگر اللہ شریعت تو بھیج دے لیکن اسے نافذ کرنے والا "حاکم" یا "مجری" مقرر نہ کرے، تو معاشرہ ہرج و مرج کا شکار ہو جائے گا اور شریعت ضائع ہو جائے گی۔ یہ اللہ کی حکمت کے خلاف ہے۔ لہٰذا اللہ پر (عقلی طور پر) لازم ہے کہ وہ شریعت کے نفاذ کے لیے ایک امام بھی مقرر کرے۔ اور چونکہ نفاذِ شریعت کے لیے "علم اور عصمت" ضروری ہے، اس لیے یہ انتخاب اللہ ہی کر سکتا ہے، عوام نہیں۔

ابن ابی الحدید اس کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ اگر "سلطانِ قاہر" (طاقتور حاکم) نہ ہو تو لوگ ایک دوسرے کا

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۲۔

[2] محمد ہادی معرفت، ولایت فقیہ، صفحہ ۳۳۔

حق کھا جائیں گے۔ پس نظمِ اجتماعی کی بقا کے لیے امامت واجب ہے۔ [1]

۲۔ احادیثِ شیعہ میں حکومت کا انعکاس

شیعہ احادیث کے ذخیرے (کتبِ اربعہ وغیرہ) کا اگر شماریاتی جائزہ لیا جائے تو یہ دعویٰ غلط ثابت ہو جاتا ہے کہ دین کا تعلق سیاست سے نہیں ہے۔ آیت اللہ رضا استادی نے اپنی تحقیق "الحکومۃ الاسلامیۃ فی احادیث الشیعۃ" میں تقریباً ۵۷۷ احادیث جمع کی ہیں جو براہِ راست "حکومت اور ریاست" کے مسائل سے متعلق ہیں۔ ان احادیث کے مضامین سے ثابت ہوتا ہے کہ ائمہ علیہم السلام نے دین کا جو ڈھانچہ پیش کیا، وہ ایک ریاست کا متقاضی ہے۔

ان احادیث میں بار بار "امام" کا لفظ آیا ہے، جس سے مراد صرف "پیش نماز" نہیں بلکہ "حاکمِ وقت" ہے۔ مثلاً حدیث میں ہے کہ "امام ہی حدود نافذ کرے گا"، "امام ہی جمعہ قائم کرے گا"۔ ان روایات کا وجود ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام میں "حکومت" ایک مفروضہ حقیقت ہے۔ اگر حکومت نہ ہو تو فقہِ شیعہ کا آدھا حصہ (کتاب الحدود، کتاب الجہاد، کتاب القضاء وغیرہ) بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ [2]

سیرتِ نبویؐ اور علویؑ؛ دینی حکومت کے مثالی نمونے

۱۔ نبوی سیاست کا ڈھانچہ

عہدِ حاضر کے سیاسی مباحث میں ایک بہت بڑا مغالطہ یہ پایا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکومت محض ایک "اخلاقی اور روحانی" قیادت تھی اور اس کا کوئی باقاعدہ "انتظامی اور سیاسی ڈھانچہ" موجود نہ تھا۔ یہ

---

[1] محمد ہادی معرفت، ولایت فقیہ، صفحہ ۳۷۔

[2] مبانی فقہی حکومت اسلامی، مبانی فقہی حکومت اسلامی، جلد ۱، صفحہ ۲۵۵۔ عمید زنجانی، دانشنامہ فقہ سیاسی، جلد ۲، صفحہ ۵۳۱۔

نظریہ تاریخ کے حقائق سے چشم پوشی کے مترادف ہے۔ ایک محقق جب مدینہ کی ریاست کا باریک بینی سے جائزہ لیتا ہے، تو اسے وہاں ایک انتہائی ترقی یافتہ اور منظم "بیوروکریسی" اور "نظامِ کار" نظر آتا ہے جو اس دور کے تقاضوں سے کہیں آگے تھا۔

کسی بھی حکومت کی کامیابی کا انحصار اس کے "انسانی طاقت" اور کارندوں کے انتخاب پر ہوتا ہے۔ انتظامیات کی زبان میں اسے "عضویابی" کہا جاتا ہے۔ یعنی حاکم کن معیارات کی بنیاد پر اپنے گورنر، جرنیل اور منتظمین منتخب کرتا ہے؟ زیرِ نظر بیان میں ہم سب سے پہلے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسی "نظامِ انتخاب" کا مطالعہ پیش کریں گے اور پھر امیر المومنین علی علیہ السلام کے دورِ حکومت کے ان "آدرشوں" (Ideals) کو بیان کریں گے جو اسلامی ریاست کا طرۂ امتیاز ہیں۔

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نظامِ انتخاب اور ہیومن ریسورس

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جزیرۃ العرب کے جاہلی معاشرے میں، جہاں قبیلہ پرستی اور خونی رشتوں کا راج تھا، ایک ایسا انقلابی "میرٹ سسٹم" متعارف کروایا جس نے انسانی تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکومتی مناصب کے لیے جو معیارات مقرر کیے، وہ آج بھی کسی اسلامی حکومت کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ ان معیارات کو ہم دو حصوں (سلبی اور ایجابی) میں تقسیم کر سکتے ہیں:

(الف) سلبی معیارات: کن چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں؟

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان تمام بتوں کو پاش پاش کر دیا جو روایتی سیاست میں "استحقاق" سمجھے جاتے تھے:

۱. نژاد اور نسل پرستی کی نفی

عرب معاشرے میں "عربیت" سب سے بڑا افتخار تھا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کابینہ اور انتظامیہ میں

ہمیں سلمان فارسی (ایرانی)، بلال حبشی (افریقی)، اور صہیب رومی (یورپی) جیسے نام کلیدی عہدوں پر نظر آتے ہیں۔ فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: "لَيْسَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى عَجَمِيٍّ فَضْلٌ إِلَّا بِالتَّقْوَى" "کسی عرب کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں، سوائے تقویٰ کے۔"[1]

آپ ﷺ نے سلمان کو "فارسی" کے بجائے "محمدی" کا لقب دیا اور باذان (ایرانی حاکم) کو یمن کی حکومت پر برقرار رکھا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلامی حکومت میں نسل یا قومیت کی بنیاد پر عہدے نہیں بانٹے جاتے۔[2]

۲. علاقائی تعصب کا خاتمہ

عام طور پر حکمران اپنے شہر یا علاقے کے لوگوں کو نوازتے ہیں۔ لیکن رسول اللہ ﷺ "مکی" تھے، اس کے باوجود آپ نے مکہ کو دارالخلافہ نہیں بنایا۔ آپ کی انتظامیہ میں مکی (مہاجر)، مدنی (انصار)، یمنی اور دیگر علاقوں کے لوگ برابر کے شریک تھے۔ شماریاتی تجزیہ بتاتا ہے کہ آپ ﷺ کے ۱۷ گورنروں میں سے ۱۰ کا تعلق یمن سے تھا، حالانکہ مرکز مدینہ تھا۔ یہ "میرٹ" کی انتہا تھی۔[3]

۳. قبیلہ پرستی اور خاندان پرستی کا رد

قریش عرب کا سردار قبیلہ تھا اور وہ خود کو حکمرانی کا فطری حقدار سمجھتے تھے۔ لیکن آپ ﷺ نے اس "قریشیت" کے بت کو توڑا۔ اگرچہ آپ ﷺ خود قریشی تھے، لیکن آپ نے زید بن حارثہ (آزاد کردہ غلام) اور ان کے بیٹے اسامہ کو لشکر کا سپہ سالار بنایا جس کے تحت بڑے بڑے قریشی سردار تھے۔ یہ اس

---

[1] مجلسی، بحار الانوار، جلد ۷۶، صفحہ ۳۵۰۔
[2] قوامی، روشِ حکومتی پیامبرؐ، صفحہ ۱۶ تا ۴۰۔
[3] قوامی، روشِ حکومتی پیامبرؐ، صفحہ ۱۶ تا ۴۰۔

بات کا عملی اعلان تھا کہ اسلامی حکومت میں "حسب و نسب" یا "خاندان" (Dynasty) کی کوئی حیثیت نہیں۔ [۱]

(ب) ایجابی معیارات: انتخاب کی بنیاد کیا تھی؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عہدوں کی تقسیم کے لیے جو حقیقی معیارات اپنائے، وہ درج ذیل "ارزشی ذرائع" تھے:

۱. سابقونِ اوّلون اور انقلابی کردار

نبویؐ نظامِ حکومت میں سب سے پہلی ترجیح ان لوگوں کو دی گئی جنہوں نے سخت ترین حالات میں اسلام کا ساتھ دیا۔

- مہاجرین: وہ جنہوں نے اپنا گھربار چھوڑا۔ یہ لوگ "مجاہدین" کا ہراول دستہ تھے۔
- انصار: وہ جنہوں نے مدینہ میں اسلام کو پناہ دی۔

قرآن نے انہیں ﴿وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ﴾ کہہ کر سندِ امتیاز عطا کی۔ انتظامی عہدوں پر ان لوگوں کا انتخاب اس لیے نہیں تھا کہ یہ کوئی مراعات یافتہ طبقہ تھے، بلکہ اس لیے تھا کہ ان کا "نظریاتی کمٹمنٹ" آزمایا ہوا تھا۔ اسلامی حکومت میں کلیدی عہدے ہمیشہ ان لوگوں کے پاس ہونے چاہئیں جن کا ماضی انقلابی جدوجہد سے عبارت ہو۔ [۲]

---

[۱] قوامی، روشِ حکومتی پیامبرؐ، صفحہ ۱۶ تا ۴۰۔

[۲] قوامی، روشِ حکومتی پیامبرؐ، صفحہ ۱۶ تا ۴۰۔

۲. صلاحیت اور علاقائی ترجیح

رسول اللہ ﷺ کی حکمتِ عملی یہ تھی کہ جہاں تک ممکن ہو، ہر علاقے پر اسی علاقے کے صالح فرد کو حاکم مقرر کیا جائے۔ یمن والوں پر یمنی، مکہ والوں پر مکی، اور قبیلوں پر انہی کے سردار۔

قرآن کا اصول ہے: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ﴾ "ہم نے ہر رسول کو اس کی قوم کی زبان میں بھیجا۔"

اس اصول کے تحت آپ ﷺ نے "عتّاب بن اسید" کو مکہ کا اور "باذان" کو یمن کا والی بنایا۔ مقامی قیادت چونکہ زمینی حقائق، زبان اور نفسیات سے واقف ہوتی ہے، اس لیے وہ انتظامی امور بہتر چلا سکتی ہے۔[1]

۳. تألیفِ قلوب اور سیاسی حکمت

یہ نبوی سیاست کا ایک انتہائی باریک اور حکیمانہ پہلو ہے۔ آپ ﷺ نے کچھ ایسے افراد کو بھی عہدے دیے جو ایمان میں کمزور تھے یا نئے نئے مسلمان ہوئے تھے (جیسے ابوسفیان یا عمرو بن العاص)۔ اسے فقہ میں "مؤلفۃ القلوب" کہا جاتا ہے۔

اس کا مقصد انہیں "رشوت" دینا نہیں تھا، بلکہ ان کی انتظامی صلاحیتوں کو اسلام کے لیے استعمال کرنا اور ان کے شر کو خیر میں بدلنا تھا۔ جیسے خالد بن ولید کی جنگی مہارت یا عمرو بن العاص کی سیاسی سوجھ بوجھ۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے انہیں کبھی بھی "نظریاتی رہنمائی" کے عہدے نہیں دیے، بلکہ صرف

---

(۱) قوامی، روشِ حکومتی پیامبرؐ، صفحہ ۱۶ تا ۴۰۔

"انتظامی یا عسکری" ذمہ داریاں دیں، وہ بھی کڑی نگرانی کے ساتھ۔[۱]

۳۔ نظامِ حکومتِ علویؑ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد، تاریخِ اسلام میں امیر المومنین علی علیہ السلام کی حکومت وہ واحد دور ہے جسے "معصوم کی حکومت" کہا جا سکتا ہے۔ اس دور میں ہمیں اسلامی ریاست کے وہ "بلند ترین اہداف" عملی شکل میں نظر آتے ہیں جو نظریاتی کتابوں میں لکھے جاتے ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام کے نزدیک حکومت "ہدف" نہیں تھی، بلکہ اعلیٰ انسانی اقدار کے حصول کا "وسیلہ" تھی۔

(الف) حکومت بطورِ وسیلہ

حضرت علی علیہ السلام کا مشہور قول ہے جو آپ نے ابنِ عباس سے فرمایا جب وہ آپؑ اپنا جوتا ٹانک رہے تھے:
"وَاللَّهِ لَهِيَ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ إِمْرَتِكُمْ إِلَّا أَنْ أُقِيمَ حَقّاً أَوْ أَدْفَعَ بَاطِلاً" "خدا کی قسم! یہ پھٹا ہوا جوتا مجھے تمہاری حکومت سے زیادہ عزیز ہے، سوائے اس کے کہ میں (اس حکومت کے ذریعے) کسی حق کو قائم کر سکوں یا کسی باطل کو مٹا سکوں۔"[۲]

یہ جملہ اسلامی حکومت کا منشور ہے۔ یعنی اقتدار بذاتِ خود "مطلوب" نہیں ہے، بلکہ یہ "اقامتِ حق" کا ایک اَوزار ہے۔

(ب) معاشی عدل اور رفاہِ عامہ

حکومتِ علوی کا سب سے روشن پہلو اس کا معاشی انصاف ہے۔ آپؑ نے بیت المال کی تقسیم میں اس

---

[۱] قوامی، روشِ حکومتی پیامبرؐ، صفحہ ۱۶ تا ۴۰۔
[۲] نہج البلاغہ، خطبہ ۳۳۔

زمانے کے رواج (طبقاتی تقسیم) کو ختم کر کے "مساوات" کو رائج کیا۔ آپؑ نے کوفہ کے شہریوں کی حالتِ زار بیان کرتے ہوئے ایک تاریخی جملہ کہا: "مَا أَصْبَحَ بِالْكُوفَةِ أَحَدٌ إِلَّا نَاعِماً، إِنَّ أَدْنَاهُمْ مَنْزِلَةً لَيَأْكُلُ الْبُرَّ وَ يَجْلِسُ فِي الظِّلِّ وَ يَشْرَبُ مِنْ مَاءِ الْفُرَاتِ" "آج کوفہ میں کوئی ایسا شخص نہیں جو خوشحال نہ ہو؛ یہاں کے ادنیٰ ترین فرد کو بھی گندم کی روٹی، رہنے کے لیے سایہ (مکان) اور پینے کے لیے فرات کا پانی میسر ہے۔"[1]

یہ "رفاہی ریاست" کا وہ ماڈل ہے جہاں ریاست ہر شہری کی بنیادی ضروریات (روٹی، کپڑا، مکان) کی ذمہ دار ہے۔[2]

(ج) انسان کی کرامت اور آزادی

امیر المومنین علیہ السلام نے حکمرانوں کو خبردار کیا کہ وہ عوام کو اپنا غلام نہ سمجھیں۔ آپؑ نے فرمایا: "لَا تَكُنْ عَبْدَ غَيْرِكَ وَ قَدْ جَعَلَكَ اللَّهُ حُرّاً" "دوسروں کے غلام مت بنو، جبکہ اللہ نے تمہیں آزاد پیدا کیا ہے۔"[3]

آپؑ کے نزدیک حکومت کا کام لوگوں کی "کرامتِ نفس" کی حفاظت ہے۔ مالک اشتر کے نام اپنے عہدنامے میں آپ لکھتے ہیں کہ لوگوں کے ساتھ درندوں جیسا سلوک نہ کرو، کیونکہ: "إِمَّا أَخٌ لَكَ فِي الدِّينِ وَ إِمَّا نَظِيرٌ لَكَ فِي الْخَلْقِ" "وہ یا تو دین میں تمہارے بھائی ہیں، یا پھر تخلیق (انسانیت)

[1] مجلسی، بحار الانوار، جلد ۴۰، صفحہ ۳۲۷۔

[2] بہرام اخوان کاظمی، آرمان ہای حکومت از دیدگاہ امام علی (ع) صفحہ ۱۳۰ تا ۱۴۴)۔

[3] نہج البلاغہ، وصیت ۳۱۔

میں تمہارے جیسے انسان ہیں۔"[۱]

یہ انسانی حقوق کا وہ آفاقی چارٹر ہے جس کی نظیر آج تک مغرب پیش نہیں کر سکا۔

(د) اہلیت پر مبنی حکمرانی

حکومتِ علوی کا ایک اور اہم ستون "اہلیت اور میرٹ" تھا۔ آپؑ نے عثمان بن حنیف، مالک اشتر اور محمد بن ابی بکر جیسے افراد کو ان کی صلاحیتوں کی بنیاد پر گورنر مقرر کیا۔ آپ فرماتے ہیں: "لَا تَقْبَلَنَّ فِي اسْتِعْمَالِ عُمَّالِكَ وَ أُمَرَائِكَ شَفَاعَةً إِلَّا شَفَاعَةَ الْكِفَايَةِ وَ الْأَمَانَةِ" "اپنے ملازمین اور افسران کے تقرر میں کسی کی سفارش قبول نہ کرنا، سوائے اس کے کہ ان کی اہلیت (کفایت) اور ایمانداری (امانت) ان کی سفارش کر رہی ہو۔"[۲]

امام علی علیہ السلام کی حکومتی سیرت؛ عملی اصلاحات اور عوامی حقوق کا چارٹر

تاریخِ اسلام میں ۲۵ سال کی طویل خاموشی کے بعد جب امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے زمامِ اقتدار سنبھالی، تو یہ محض اقتدار کی تبدیلی نہیں تھی، بلکہ یہ "اقدار کی بحالی" کا دور تھا۔ امام علی علیہ السلام کو ایک ایسی ریاست ملی جو بدعنوانی، اقرباء پروری اور طبقاتی تقسیم سے بھری ہوئی تھی۔ آپ کا ہدف صرف حکومت کرنا نہیں تھا، بلکہ معاشرے کو واپس نبویؐ نہج پر لانا تھا۔ فریقین (شیعہ و سنی) کے منابع اس بات پر متفق ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد امت کی قیادت کے لیے سب سے شائستہ اور لائق ترین فرد علی علیہ السلام ہی تھے۔ یہاں تک کہ خلیفہ دوم عمر بن خطاب نے بھی اعتراف کیا تھا: "لَوْ وَلِيَهُمْ لَحَمَلَهُمْ عَلَى الْمَحَجَّةِ الْبَيْضَاءِ" "اگر علیؑ ان (مسلمانوں) کے حاکم بن جائیں تو وہ یقیناً انہیں روشن راستے

---

[۱] نہج البلاغہ، مکتوب ۵۳۔

[۲] محمد مہدی شمس الدین، نظام الحکم و الإدارۃ فی الإسلام، صفحہ ۳۰۱۔

(صراطِ مستقیم) پر چلائیں گے۔"[1]

اب ہم یہاں امام علی علیہ السلام کے حکومتی منشور کے ان تین بنیادی ستونوں کا جائزہ لیں گے جو آج بھی ایک مثالی اسلامی حکومت کی بنیاد ہیں: ۱. عوام نوازی اور عوامی رضایت ۲. حقوقِ انسانی اور آزادیٔ اظہار ۳. اصلاحات اور میرٹ۔

۱۔ عوام نوازی: اسلامی جمہوریت کی روح

حکومتِ علوی کی سب سے نمایاں خصوصیت "عوام نوازی" و "عوام دوستی" تھی۔۔ امام علی علیہ السلام کے نزدیک حکومت کا استحکام "فوج" یا "خفیہ ایجنسیوں" پر نہیں، بلکہ "عوام کی رضایت" پر منحصر ہے۔ آپ نے اپنے گورنر مالک اشتر کو جو تاریخی عہدنامہ لکھا، اس میں فرمایا: "وَلْيَكُنْ أَحَبَّ الْأُمُورِ إِلَيْكَ... أَجْمَعُهَا لِرِضَا الرَّعِيَّةِ" "تمہارے نزدیک سب سے پسندیدہ کام وہ ہونا چاہیے جو حق میں سب سے درمیانہ ہو، انصاف میں سب سے زیادہ شامل ہو، اور رعایا (عوام) کی رضایت کو سب سے زیادہ سمیٹنے والا ہو۔"[2]

امام نے یہاں ایک سنہری اصول بیان کیا کہ "خواص" کی ناراضگی برداشت کی جا سکتی ہے اگر عوام راضی ہوں، لیکن اگر عوام ناراض ہو جائیں تو خواص کی خوشنودی حکومت کو نہیں بچا سکتی۔ یہ آج کے دور میں "جمہوریت" کی حقیقی روح ہے۔

البتہ، امام کی عوام نوازی میں اور مغربی جمہوریت میں ایک باریک فرق ہے۔ مغربی جمہوریت عوام کی "خواہشات" پوری کرتی ہے (چاہے وہ غلط ہوں)، جبکہ امام علی علیہ السلام عوام کی "ضروریات" پوری کرتے

[1] ری شہری، موسوعۃ الإمام علی بن أبی طالب علیہ السلام فی الکتاب والسنۃ والتاریخ، جلد ۳، صفحہ ۹۹۔
[2] نہج البلاغہ، مکتوب ۵۳۔

تھے۔ جب آپ نے محمد بن ابی بکر کو مصر کا گورنر بنایا تو فرمایا: "وَلَا تُسْخِطِ اللَّهَ بِرِضَى أَحَدٍ مِنْ خَلْقِهِ" "کسی مخلوق کو راضی کرنے کے لیے اللہ کو ناراض نہ کرنا۔"[1]

یعنی عوامی رضایت وہاں تک معتبر ہے جہاں تک وہ اللہ کے حکم سے نہ ٹکرائے۔

۲۔ اصلاحات اور مصلحت میں ٹکراؤ

جب امام علی علیہ السلام نے اقتدار سنبھالا تو معاشرہ بگاڑ کا شکار تھا۔ آپ کا مشن "اصلاحات" تھا۔ لیکن اصلاحات ہمیشہ کڑوی ہوتی ہیں۔ یہاں امامؑ کو ایک دوراہے کا سامنا تھا: یا تو "مصلحت پسندی" سے کام لے کر عوام کو خوش رکھیں اور بگاڑ رہنے دیں، یا پھر "اصول پرستی" اپنائیں اور عوامی ناراضگی مول لیں۔

امام نے اصلاحات کو دو حصوں میں تقسیم کیا:

۱. انتظامی اور اقتصادی اصلاحات: ان میں آپ نے کوئی لچک نہیں دکھائی۔ بیت المال کی لوٹ مار بند کی، نااہل گورنروں کو ہٹایا اور زمینوں کی ناجائز الاٹمنٹ منسوخ کی۔ اس پر آپؑ نے فرمایا: "اگر یہ مال ان کے مہروں میں بھی چلا گیا ہو تو واپس لاؤں گا۔"

۲. ثقافتی اصلاحات: کچھ معاشرتی بگاڑ ایسے تھے جو لوگوں کی رگ و پے میں بس چکے تھے (جیسے نمازِ تراویح کی بدعت یا متعہ حج کا مسئلہ)۔ یہاں امام نے حکمت سے کام لیا۔ آپ نے فرمایا: "لَوْ اسْتَوَتْ قَدَمَايَ... لَغَيَّرْتُ أَشْيَاءَ" "اگر میرے قدم جم گئے تو میں بہت سی چیزیں بدل دوں گا۔"[2]

---

[1] ری شہری، موسوعۃ الإمام علی بن أبی طالب علیہ السلام فی الکتاب والسنۃ والتاریخ، جلد ۴، صفحہ ۲۳۳۔
[2] کلینیؒ، اصول کافی، جلد ۸، حدیث ۲۱۔

یعنی ثقافتی اصلاحات کے لیے آپ نے "ذہن سازی" کا راستہ اپنایا، جبر کا نہیں۔

۳۔ حقوقِ متقابلہ: حکمران اور شہری کا رشتہ

امام علی علیہ السلام نے حکمران اور شہری کے تعلق کو "آقا اور غلام" کے بجائے "حقوق و فرائض" کے رشتے میں بدلا۔ آپ نے فرمایا: "فَقَدْ جَعَلَ اللَّهُ سُبْحَانَهُ لِي عَلَيْكُمْ حَقّاً... وَ لَكُمْ عَلَيَّ مِنَ الْحَقِّ مِثْلُ الَّذِي لِي عَلَيْكُمْ" "اللہ نے تمہارے اوپر میرا حق (اطاعت) رکھا ہے، اور میرے اوپر تمہارا حق (عدل و کفالت) رکھا ہے۔ حق یکطرفہ نہیں ہوتا، اگر کسی کے حق میں ہے تو اس کے خلاف (ذمہ داری) بھی ہے۔"[1]

آپ نے فرمایا کہ مجھ پر تمہارے تین بڑے حقوق ہیں:

۱. تعلیم: تمہیں جہالت سے نکالنا۔

۲. تربیت: تمہیں اخلاقی طور پر سنوارنا۔

۳. معیشت: تمہارا بیت المال کا حصہ تم تک پہنچانا۔

جب تک حکمران یہ حقوق ادا نہ کرے، اسے عوام سے اطاعت مانگنے کا کوئی حق نہیں۔

۴۔ آزادیِ اظہار اور حقِ تنقید

یہ حکومتِ علوی کا وہ باب ہے جو آج کی نام نہاد جمہوری حکومتوں کے لیے بھی ایک چیلنج ہے۔ امام علی علیہ السلام، جو معصوم ہیں اور خطا سے پاک ہیں، وہ اپنے شہریوں سے فرماتے ہیں: "فَلَا تُكَلِّمُونِي بِمَا تُكَلَّمُ

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۲۱۶۔

بِهِ الْجَبَابِرَةُ... وَ لَا تَظُنُّوا بِي اسْتِثْقَالاً فِي حَقٍّ قِيلَ لِي" "مجھ سے اس لہجے میں بات نہ کرو جیسے جابر بادشاہوں سے کی جاتی ہے (خوشامدانہ)... اور یہ گمان نہ کرو کہ اگر میرے سامنے حق بات کہی جائے گی تو مجھے گراں گزرے گی۔"[1]

پھر آپ نے وہ تاریخی جملہ کہا جو آزادیٔ رائے کا چارٹر ہے: "فَلَا تَكُفُّوا عَنْ مَقَالَةٍ بِحَقٍّ أَوْ مَشُورَةٍ بِعَدْلٍ" "حق بات کہنے یا انصاف کا مشورہ دینے سے خود کو مت روکو۔"

عملی نمونہ: جنگِ صفین میں جب خارجیوں نے آپ پر شدید تنقید کی، حتیٰ کہ آپ کے منہ پر "کافر" تک کہا، تو آپ نے ان کے خلاف کارروائی نہیں کی۔ آپ نے فرمایا: "جب تک تم ہاتھ سے تلوار نہیں اٹھاؤ گے، ہم تمہیں بیت المال سے بھی حصہ دیں گے اور مسجد میں آنے سے بھی نہیں روکیں گے۔" آپ نے تنقید اور بغاوت میں واضح فرق رکھا۔ تنقید کو سنا اور دلیل سے جواب دیا، لیکن جب انہوں نے نہروان میں قتل وغارت شروع کی، تب تلوار اٹھائی۔

۵۔ مخالفین سے برتاؤ

امام علی علیہ السلام نے سیاسی مخالفین (ناکثین، قاسطین، مارقین) کے ساتھ جو سلوک کیا وہ "رَواداری" کی اعلیٰ مثال ہے۔

- جنگِ جمل (ناکثین): جنگ جیتنے کے بعد آپ نے دشمنوں کو عام معافی دی، عائشہ کو عزت سے مدینہ بھیجا اور بھاگنے والوں کا پیچھا نہیں کیا۔
- جنگِ صفین (قاسطین): معاویہ نے پانی بند کیا، لیکن جب آپ کا قبضہ ہوا تو آپ نے پانی کھول

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۲۱۶۔

دیا۔

- خوارج (مارقین): انہیں بحث و مباحثے کی دعوت دی اور ابنِ عباس کو بھیج کر ان کے شبہات دور کیے۔ اس مکالمے کے نتیجے میں ہزاروں خوارج توبہ کر کے واپس آ گئے۔

باب سوم: نظریۂ ولایتِ فقیہ کا تاریخی سفر

ولایتِ فقیہ؛ فقہِ شیعہ میں اس کی تاریخی جڑیں اور ارتقائی مراحل

عصرِ حاضر میں بعض روشن خیال حلقوں اور سیاسی مخالفین کی جانب سے تواتر کے ساتھ یہ پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ "ولایتِ فقیہ" کا نظریہ شاید بیسویں صدی کی پیداوار ہے یا یہ امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتی اجتہادی اختراع ہے جس کا ماضی کی فقہ سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ قدیم علماء دین اور سیاست کی جدائی کے قائل تھے اور یہ نظریہ محقق نراقیؒ یا امام خمینیؒ نے ایجاد کیا۔ لیکن جب ہم فقہِ امامیہ کی ہزار سالہ تاریخ، کتبِ اربعہ اور متقدمین فقہاء کی تصانیف کا غیر جانبدارانہ اور محققانہ مطالعہ کرتے ہیں، تو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ یہ نظریہ کوئی "نوپید" چیز نہیں ہے، بلکہ غیبتِ کبریٰ کے آغاز سے لے کر آج تک فقہائے امامیہ کے درمیان ایک مسلمہ حقیقت کے طور پر موجود رہا ہے۔

یہ درست ہے کہ ماضی میں "ولایتِ فقیہ" کے نام سے کوئی الگ باب یا مستقل کتاب شاید کم لکھی گئی ہو (سوائے حالیہ صدیوں کے)، لیکن فقہ کے مختلف ابواب—جیسے کتاب القضاء، کتاب الحدود، کتاب الجہاد، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، خمس و زکوٰۃ، اور ولایت بر ممتنعین—میں فقہاء نے اس بحث کو چھیڑا ہے اور "حاکمِ شرع"، "نائبِ امام" یا "من لہ الحکم" کے عنوان سے فقیہ کے اختیارات پر مفصل گفتگو کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام فقہائے شیعہ اس بات پر متفق رہے ہیں کہ زمانہ غیبت میں "طاغوت" کی حکومت نامشروع ہے اور حکومت کا حقیقی حق صرف فقیہِ عادل کو حاصل ہے۔ اگر ماضی میں یہ نظام قائم نہیں ہو سکا تو اس کی وجہ "نظریے کا فقدان" نہیں تھی، بلکہ "حالات کی ناسازگاری" اور سیاسی دباؤ تھا۔ ہم یہاں اسی تاریخی تسلسل کا جائزہ لیں گے اور ثابت کریں گے کہ شیخ مفیدؒ سے لے کر صاحبِ جواہرؒ تک، یہ

سلسلہ ایک سنہری زنجیر کی طرح جڑا ہوا ہے۔[۱]

پہلا مرحلہ: عصرِ حضور اور غیبت کے لیے زمینہ سازی

ولایتِ فقیہ کا نظریہ اچانک آسمان سے نہیں اترا، بلکہ اس کی بنیادیں خود ائمہ معصومین علیہم السلام نے اپنے دورِ حضور ہی میں استوار کر دی تھیں۔ ائمہ علیہم السلام جانتے تھے کہ عنقریب ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے جب امت کا رابطہ امامِ معصوم سے ظاہری طور پر منقطع ہو جائے گا، لہٰذا انہوں نے شیعیانِ علی کو "عصرِ غیبت" کے لیے تیار کرنے کی خاطر دو اہم تدابیر اختیار کیں:

اول: نصبِ عام

ائمہ علیہم السلام نے احادیث کے ذریعے فقیہانِ دین کی شان و منزلت بیان کی اور انہیں اپنا "حجت" اور "حاکم" قرار دیا۔ مشہور روایت "مقبولہ عمر بن حنظلہ" اور "توقیعِ مبارک" اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ امام صادق علیہ السلام نے فرمایا: "فَإِنِّي قَدْ جَعَلْتُهُ عَلَيْكُمْ حَاكِماً" "پس میں نے اس (فقیہ) کو تم پر حاکم مقرر کیا ہے۔"[۲]

امامؑ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں نے اسے صرف "مسئلہ بتانے والا" بنایا ہے، بلکہ "حاکم" کا لفظ استعمال کیا جو قضاوت اور ولایت دونوں پر دلالت کرتا ہے۔

دوم: وکالت کا نظام

دوسری عملی تدبیر یہ تھی کہ ائمہ علیہم السلام، بالخصوص امام رضا علیہ السلام کے بعد، اپنے نمائندوں (وکلاء) کا ایک جال بچھا دیا جو کوفہ، قم، بغداد، اور خراسان جیسے علاقوں میں پھیلا ہوا تھا۔ یہ وکلاء صرف شرعی مسائل نہیں

---

[۱] مصطفیٰ جعفر پیشہ فرد پیشینہ نظریہ ولایت فقیہ، صفحہ ۲۹۔

[۲] حر عاملی، وسائل الشیعہ، جلد ۱۸، باب ۱۱۔

بتاتے تھے بلکہ "خمس وزکوٰۃ" وصول کرتے تھے اور سیاسی و سماجی امور میں شیعوں کی قیادت کرتے تھے۔ یہ "وکالت کا نظام" در حقیقت "ولایتِ فقیہ" کی "پریکٹس" (مشق) تھی تاکہ قوم کو عادت ہو جائے کہ امام کی غیبت میں ان کے نائب کی اطاعت کرنی ہے۔[1]

دوسرا مرحلہ: متقدمین فقہاء کا دور (چوتھی اور پانچویں صدی ہجری)

غیبتِ کبریٰ کے آغاز کے ساتھ ہی جب فقہاء نے قلم سنبھالا تو انہوں نے ولایتِ فقیہ کو ایک "مسلمہ اصول" کے طور پر پیش کیا۔ اس دور کے سرخیل شیخ مفیدؒ (متوفی ۴۱۳ھ) ہیں۔ آپ اپنی کتاب "المقنعہ" میں فرماتے ہیں: "وَ إِذَا عَدِمَ السُّلْطَانُ الْعَادِلُ... كَانَ لِفُقَهَاءِ أَهْلِ الْحَقِّ الْعُدُولِ مِن ذَوِي الرَّأْيِ وَ الْعَقْلِ وَ الْفَضْلِ أَن يَتَوَلَّوْا مَا تَوَلَّاهُ السُّلْطَانُ" "اور جب سلطانِ عادل (امام معصوم) موجود نہ ہوں... تو فقہائے حق (شیعہ فقہاء) جو صاحبِ رائے، عقل اور فضل ہوں، ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان تمام امور کی ولایت (سرپرستی) سنبھال لیں جو سلطان (امام) سنبھالتے تھے۔"[2]

شیخ مفیدؒ یہاں "ما تولاہ السلطان" کہہ کر فقیہ کو وہ تمام اختیارات دے رہے ہیں جو امامؑ کے پاس تھے، سوائے ان امور کے جو "نصِ خاص" سے مخصوص ہوں۔

اس کے بعد شیخ طوسیؒ (متوفی ۴۶۰ھ) کا نام آتا ہے جو "شیخ الطائفہ" کہلاتے ہیں۔ آپ اپنی کتاب "النہایۃ" میں لکھتے ہیں کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں بعض اوقات مارنے پیٹنے، قید کرنے اور حد جاری کرنے کی نوبت آتی ہے، اور یہ کام سوائے "سلطانِ وقت" (امام) یا اس کے "منصوب کردہ نائب"

---

[1] رسول جعفریان، حیات فکری وسیاسی امامان شیعہ، صفحہ ۱۵۴۔

[2] شیخ مفید، المقنعہ، صفحہ ۶۷۵۔

(فقیہ) کے کسی کے لیے جائز نہیں: "وَ لَيْسَ ذَلِكَ لِأَحَدٍ إِلَّا لِسُلْطَانِ الزَّمَانِ الْمَنْصُوبِ مِنْ قِبَلِ اللَّهِ تَعَالَى أَوْ مَنْ نَصَبَهُ السُّلْطَانُ" "یہ حق کسی کو نہیں سوائے اس سلطان کے جو اللہ کی طرف سے منصوب ہو، یا اس شخص کے جسے سلطان نے نصب کیا ہو (یعنی فقیہ)۔"(۱)

اس دور کے دیگر فقہاء جیسے ابوالصلاح حلبیؒ اور سلارؒ نے بھی تصریح کی ہے کہ نفاذِ احکام اور اقامتِ حدود کا حق صرف فقہاء کو حاصل ہے۔(۲)

تیسرا مرحلہ: محقق حلیؒ سے محقق کرکیؒ تک (فقہِ استدلالی کا عروج)

اس دور میں فقہاء نے ولایتِ فقیہ کے دائرہ کار کو مزید واضح کیا۔ محقق حلیؒ (صاحبِ شرائع) فرماتے ہیں کہ "سہمِ امام" (خمس) کو خرچ کرنے کا اختیار صرف اس شخص کو ہے جو "حکمِ نیابت" رکھتا ہو "من اليه الحكم بحق النيابه"۔

اس کے بعد علامہ حلیؒ (متوفی ۷۲۶ھ) نے "تذکرۃ الفقہاء" میں واضح کیا کہ فقیہِ عادل کی اطاعت واجب ہے کیونکہ وہ امام کا نائب ہے: "لِأَنَّ الْفَقِيهَ الْمَأْمُونَ مَنْصُوبٌ مِنْ قِبَلِ الْإِمَامِ" "کیونکہ امانت دار فقیہ امام کی طرف سے منصوب ہے۔"(۳)

شہید ثانیؒ (متوفی ۹۶۵ھ) نے "مسالک الافہام" میں فرمایا کہ اگر کوئی معاملہ ایسا ہو جس میں ولی (باپ دادا) نہ ہو تو وہاں "حاکمِ شرع" ولی ہے، اور حاکم سے مراد تمام ابوابِ فقہ میں "فقیہِ جامع الشرائط" ہے۔

---

(۱) شیخ طوسی، النہایۃ، باب الامر بالمعروف۔
(۲) ابوالصلاح حلبی، الکافی فی الفقہ، صفحہ ۴۲۰۔
(۳) علامہ حلی، تذکرہ، کتاب الخمس۔

یہ بات فقہاء کے درمیان متفق علیہ ہے۔[۱]

چوتھا مرحلہ: صفوی دور اور ولایت کا عملی اظہار

دسویں صدی ہجری میں جب ایران میں صفوی حکومت قائم ہوئی اور تشیع کو سرکاری مذہب قرار دیا گیا، تو فقہاء کو کھل کر بات کرنے کا موقع ملا۔ اس دور کے عظیم فقیہ محقق کرکیؒ (محقق ثانی) نے تاریخ میں پہلی بار ولایتِ فقیہ کو ایک "سیاسی طاقت" کے طور پر منوایا۔ آپ نے واضح طور پر لکھا: "اتَّفَقَ أَصْحَابُنَا عَلَى أَنَّ الْفَقِيهَ الْعَادِلَ... نَائِبٌ مِن قِبَلِ أَئِمَّةِ الْهُدَى فِي حَالِ الْغَيْبَةِ فِي جَمِيعِ مَا لِلنِّيَابَةِ فِيهِ مَدْخَلٌ" "ہمارے اصحاب (فقہاء) کا اس بات پر اتفاق (اجماع) ہے کہ فقیہِ عادل... زمانہ غیبت میں ائمہ ہدیٰ (ع) کا نائب ہے ان تمام امور میں جن میں نیابت کا دخل ہے۔"[۲]

محقق کرکیؒ نے شاہ طہماسب صفوی کو اجازت دی کہ وہ بادشاہت کرے، لیکن یہ اجازت اس بنیاد پر تھی کہ "اصل حاکم فقیہ ہے" اور بادشاہ فقیہ کا "کارندہ" بن کر کام کرے گا۔ یہ ولایتِ فقیہ کا عملی ظہور تھا۔ اسی دور میں مقدس اردبیلیؒ نے بھی ظالم حکمرانوں کے مقابلے میں فقیہ کے اختیارات پر زور دیا۔

پانچواں مرحلہ: قاجاری دور اور ولایتِ عامہ کا نظریہ (کاشف الغطاء و نراقی)

تیرہویں صدی ہجری میں ولایتِ فقیہ کی بحث اپنے عروج پر پہنچی۔ شیخ جعفر کاشف الغطاءؒ نے فتح علی شاہ قاجار کو جہاد کا حکم دیا اور کہا کہ چونکہ میں امام کا نائب ہوں، اس لیے تمہیں جہاد کی اجازت دیتا ہوں۔ آپ نے "کشف الغطاء" میں لکھا کہ اگر مجتہد کسی حد (سزا) کا حکم دے تو اس کا نفاذ واجب ہے۔

---

[۱] شہید ثانی، مسالک الافہام، کتاب الوصیۃ۔

[۲] محقق کرکی، رسائل، جلد ۱، صفحہ ۱۴۲۔

اس کے بعد وہ شخصیت آتی ہے جسے ولایتِ فقیہ کا سب سے بڑا شارح مانا جاتا ہے، **یعنی مولا احمد نراقیؒ** (متوفی ۱۲۴۵ھ)۔ انہوں نے اپنی کتاب "عوائدالایام" میں ولایتِ فقیہ پر ایک مستقل باب باندھا اور ۱۹ احادیث سے استدلال کرتے ہوئے ثابت کیا کہ: "جو بھی اختیار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امام علیہ السلام کو حاصل تھا (سوائے ان امور کے جو ان کی ذات سے مخصوص تھے)، وہ تمام اختیارات فقیہِ عادل کو حاصل ہیں۔"[1]

صاحبِ جواہرؒ کا تاریخی جملہ: فقہِ شیعہ کی سب سے بڑی کتاب "جواہرالکلام" کے مصنف **شیخ محمد حسن نجفیؒ** نے ولایتِ فقیہ کے منکرین کے بارے میں وہ تاریخی جملہ کہا جو آج بھی ضرب المثل ہے: "فَمَن وَسْوَسَ فِي هَذَا فَقَدْ وَسْوَسَ فِي طَعْمِ الْفِقْهِ" "جو شخص ولایتِ فقیہ کے بارے میں وسوسے (شک) کا شکار ہے، اس نے فقہ کا ذائقہ ہی نہیں چکھا اور وہ ائمہ علیہم السلام کے کلام کے رمز کو نہیں سمجھا۔"[2]

شیخ انصاریؒ کا موقف: بعض لوگ گمان کرتے ہیں کہ شیخ مرتضیٰ انصاریؒ (شیخِ اعظم) ولایتِ فقیہ کے قائل نہیں تھے۔ یہ غلط فہمی ہے۔ شیخ انصاری نے "کتاب المکاسب" میں کچھ جزئیات میں بحث کی ہے، لیکن اپنی دوسری کتاب "کتاب القضاء" میں اور مکاسب ہی کے دیگر مقامات پر واضح کیا ہے کہ: "فَإِنَّهُمْ حُجَّتِي عَلَيْكُمْ" "اس توقیع مبارک کا مطلب یہ ہے کہ فقیہ تمام امور میں امام کی حجت ہے، اور اس کی اطاعت اسی طرح واجب ہے جیسے امام کی۔"[3]

---

[1] محسن کدیور، نظریہ ہائے دولت، صفحہ ۱۲۵۔

[2] نجفی، جواہر الکلام، جلد ۲۱، صفحہ ۳۹۷۔

[3] شیخ انصاری، کتاب القضاء، صفحہ ۴۹۔

نظامِ ولایتِ فقیہ اور برصغیر میں علماء کا فقہی و سیاسی کردار

برصغیر ہند و پاک کی علمی و سیاسی تاریخ میں اس نظریے کا عملی ظہور ریاستِ اودھ (لکھنؤ) کے قیام اور آیت اللہ العظمیٰ سید دلدار علی بن محمد معین النصیر آبادی لکھنوی (۱۱۶۶ھ تا ۱۲۳۵ھ) کی جدوجہد سے مربوط ہے۔ آپ، وہ پہلی شخصیت تھے جنہوں نے ہندوستان میں باقاعدہ طور پر قواعدِ دین کی بنیاد رکھی اور اس خطے میں مسلکِ جعفریہ کی سیادت سنبھالی[1]۔ عراق و ایران میں اپنے عظیم المرتبت اساتذہ سے درجۂ اجتہاد کی سند پاکر ۱۲۰۰ھ میں جب آپ لکھنؤ تشریف لائے، تو آپ نے یہاں اجتہاد و تقلید کے نظام کو اس استحکام کے ساتھ رائج کیا کہ آپ کو برصغیر سے ابھرنے والا پہلا "مرجعِ تقلید" تسلیم کیا گیا[2]۔ آپ کی جانب سے رجب ۱۲۰۰ھ میں نمازِ جمعہ کی پہلی اقامت محض ایک مذہبی فریضہ نہ تھا بلکہ یہ اس 'بسطِ ید' اور نیابتِ عامہ کا اظہار تھا جو ایک فقیہِ عادل کو حاصل ہوتا ہے[3]۔ آپ نے "اساس الاصول" کے ذریعے اخباریت کے جمود کا خاتمہ کیا اور "عماد الاسلام" جیسی ضخیم تالیف کے ذریعے، جو شیعہ عقائد کی سب سے بڑی کتاب مانی جاتی ہے، نظریاتی محاذ پر فقیہ کی ولایت کو مستحکم کیا[4]۔

آیت اللہ العظمیٰ سید دلدار علیؒ کے بعد آپ کے فرزندوں نے اس منصبِ ولایت و نیابت کو ریاست کے انتظامی اور تعلیمی ڈھانچے میں سمو دیا۔ آپ کے فرزندِ اکبر سید محمد، المعروف بہ 'سلطان العلماء' (۱۱۹۹ھ تا ۱۲۸۴ھ)، نے والد کی رحلت کے بعد قوم کی زعامت سنبھالی[5]۔ سلطان العلماء کا سیاسی و فقہی

---

[1] علی نقی نقوی، تراجم مشاہیر علماء ہند، جلد ا، صفحہ ۱۴۵۔

[2] مکارم شیرازی، رضایی اصفہانی، شیعہ و علوم اسلامی، جلد ۲، صفحہ ۳۸۰۔

[3] مکارم شیرازی، رضایی اصفہانی، شیعہ و علوم اسلامی، جلد ۲، صفحہ ۳۸۰۔

[4] محققین ادارہ کل پژوہش دفتر تبلیغات اسلامی، مجموعہ مقالات ہند شناخت، جلد ا، صفحہ ۲۴۔

[5] سبحانی تبریزی، موسوعہ طبقات الفقہاء، جلد ۱۳، صفحہ ۴۶۱۔

اقتدار اس وقت اپنے عروج پر پہنچا جب ریاستِ اودھ کے حکمران سلطان امجد علی شاہ نے امورِ حکم اور منصبِ قضا مکمل طور پر آپ کے سپرد کر دیے اور یہ شاہی فرمان جاری کیا گیا کہ مملکت کے تمام قُضات صرف سلطان العلماء کے فتاویٰ کے مطابق فیصلے کرنے کے پابند ہوں گے [۱]۔ یہ عملی طور پر ولایتِ فقیہ کی وہ صورت تھی جہاں سیاسی حاکمیت نے خود کو فقیہِ عادل کے شرعی اقتدار کے تابع کر دیا تھا۔ اسی طرح آپ کے دوسرے فرزند سید حسین، المعروف بہ 'سید العلماء' (۱۲۱۱ھ تا ۱۲۷۳ھ)، کے عہد میں سلطان واجد علی شاہ کے حکم سے برصغیر کا پہلا منظم شیعہ مدرسہ 'مدرسہ سلطانیہ' قائم ہوا، جس نے نظامِ ولایت کے لیے افرادی قوت کی فراہمی میں کلیدی کردار ادا کیا [۲]۔ خاندانِ اجتہاد کی دیگر نمایاں شخصیات جیسے سید مصطفیٰ (عماد العلماء)، جو تمام ہند میں مرجعیتِ عامہ رکھتے تھے [۳]، اور سید محمد ہادی (عمدۃ العلماء)، جنہوں نے مسیحی مبلغین کے مقابلے میں اسلام کا دفاع کیا [۴]، اور علمی و سماجی سطح پر عظمتِ فقیہ کا لوہا منوایا۔

برصغیر میں علمائے شیعہ، بالخصوص خاندانِ اجتہاد، نے 'مرجعیتِ دینی' اور 'قضاوتِ شرعی' کے ذریعے عملاً ولایتِ فقیہ کے اصولوں کو نافذ کیا۔ اگرچہ اس وقت 'ولایتِ مطلقہ' کی دینی—سیاسی اصطلاح اس طرح رائج نہ تھی جیسی موجودہ دور میں ہے، تاہم سلطان العلماء جیسے فقیہ کو حاصل براہِ راست عدالتی و انتظامی اختیارات اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ آپ غیبتِ کبریٰ کے مخصوص حالات میں امامِ معصوم علیہ السلام کے نائب کے طور پر معاشرے کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے تھے۔ لکھنؤ کا معاشرہ اس وقت 'ریاست کے اندر ریاست' کا عملی نمونہ پیش کر رہا تھا جہاں مذہبی، سماجی اور عدالتی معاملات کا

---

[۱] سبحانی تبریزی، موسوعہ طبقات الفقہاء، جلد ۱۳، صفحہ ۴۶۱۔

[۲] سبحانی تبریزی، موسوعہ طبقات الفقہاء، جلد ۱۳، صفحہ ۲۱۵۔

[۳] علی نقی نقوی، تراجم مشاہیر علماءِ ہند، جلد ۱، صفحہ ۲۷۲۔

[۴] علی نقی نقوی، تراجم مشاہیر علماءِ ہند، جلد ۱، صفحہ ۲۲۳۔

حتمی فیصلہ فقیہ کے ہاتھ میں تھا، جو در حقیقت ولایتِ فقیہ کے تاریخی سفر کا ایک اہم اور سنہرا باب ہے۔

ماضی میں نظام ولایت فقیہ قائم نہ ہونے کی وجوہات

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر تمام فقہاء ولایتِ فقیہ کے قائل تھے، تو ماضی میں یہ حکومت قائم کیوں نہیں ہوئی؟" اس کی بنیادی وجوہات درج ذیل ہیں:

۱. سیاسی استبداد اور تقیہ: شیعہ تاریخ کا بیشتر حصہ بنوامیہ، بنوعباس اور دیگر سنی بادشاہتوں کے زیرِ سایہ گزرا جہاں شیعوں کا قتلِ عام، عام سی بات تھی۔ ایسے میں حکومت بنانا تو دور، جان بچانا مشکل تھا۔ اس لیے فقہاء "تقیہ" پر مجبور تھے۔

۲. بسطِ ید کا فقدان: فقہی اصطلاح میں حاکم کے لیے "مبسوط الید" (بااختیار) ہونا ضروری ہے۔ ماضی میں فقہاء کے پاس عوامی طاقت اور وسائل نہیں تھے کہ وہ حکومت بنا سکیں۔ عدمِ حکومت، "عدمِ نظریہ" کی دلیل نہیں، بلکہ "عدمِ قدرت" کا نتیجہ تھی۔

۳. حسبہ بطورِ متبادل: چونکہ مکمل حکومت ممکن نہیں تھی، اس لیے فقہاء نے "امورِ حسبیہ" کے نام سے ایک "ریاست کے اندر ریاست" قائم کر رکھی تھی۔ وہ یتیموں کی کفالت کرتے، شرعی فیصلے کرتے اور خمس تقسیم کرتے۔ یہ دراصل ولایتِ فقیہ کا "مینی ایچر" (مختصر) ماڈل تھا جو اس وقت ممکن تھا۔

۴. نظریاتی ارتقاء: ہر نظریہ وقت کے ساتھ نکھرتا ہے۔ قدیم دور میں بحث صرف "فتویٰ اور قضاوت" تک تھی، صفوی دور میں "نظارت" تک پہنچی، اور امام خمینیؒ کے دور میں یہ مکمل "سیاسی نظام" بن کر ابھری۔

جدید دور میں سیاسی فکر کا ارتقاء اور امام خمینیؒ کا انقلابی کردار

انجماد سے تحریک تک

غیبتِ کبریٰ کے ابتدائی ادوار میں اگرچہ ولایتِ فقیہ کا نظریہ موجود تھا، لیکن سیاسی حالات کے جبر نے اسے عملی میدان سے دور رکھا۔ تاہم، بیسویں صدی عیسوی (چودھویں صدی ہجری) ایران اور عالمِ تشیع کے لیے ایک "فکری زلزلے" کی صدی ثابت ہوئی۔ استعمار کی یلغار اور داخلی استبداد نے علماء کو مجبور کیا کہ وہ اپنی "روایتی تنہائی" سے باہر نکلیں اور "اسلام کے سیاسی نظام" پر از سرِ نو غور کریں۔

اس جدید دور میں علمائے شیعہ کے درمیان تین بڑے "فکری دھارے" ابھر کر سامنے آئے، جن کے تصادم اور تعامل نے بالآخر انقلابِ اسلامی کی راہ ہموار کی:

۱. پہلا دھارا: سیاست سے گریز اور روایتی فقہ پر قناعت۔

۲. دوسرا دھارا: مشروطیت اور نظارت۔

۳. تیسرا دھارا: ولایتِ مطلقہ اور حکومتِ اسلامی (امام خمینیؒ کا نظریہ)۔

ہم ان تینوں مراحل کا مطالعہ کرتے ہوئے دیکھیں گے کہ امام خمینیؒ نے کس طرح فقہ کو "مسئلہ بتانے" سے نکال کر "ریاست چلانے" کے منصب پر فائز کیا۔

پہلا مرحلہ: مشروطیت کا تجربہ اور اس کی ناکامی

بیسویں صدی کے آغاز میں "تحریکِ مشروطیت" (۱۹۰۶ء) علمائے شیعہ کا پہلا بڑا سیاسی اقدام تھا۔ اس تحریک میں علماء (جیسے آخوند خراسانیؒ اور علامہ نائینیؒ) کا ہدف "حکومتِ اسلامی" کا قیام نہیں تھا، بلکہ وہ "بادشاہت کو محدود" کرنا چاہتے تھے۔

علامہ نائینیؒ نے اپنی کتاب "تنبیہ الامۃ" میں استدلال پیش کیا کہ چونکہ امامِ معصوم غائب ہیں اور مثالی حکومت ممکن نہیں، لہٰذا "دفعِ افسد بہ فاسد" کے اصول کے تحت بادشاہت کو آئین اور پارلیمنٹ کا پابند بنا دیا جائے تاکہ ظلم کم ہو سکے۔ یہ نظریہ "ولایت" کے بجائے "نظارت" پر مبنی تھا۔ یعنی فقہاء حکومت نہیں کریں گے، بلکہ صرف یہ دیکھیں گے کہ قوانین اسلام کے خلاف نہ بنیں۔

لیکن یہ تجربہ ناکام ہو گیا۔ استعماری طاقتوں اور سیکولر عناصر نے مشروطیت کو ہائی جیک کر لیا اور شیخ فضل اللہ نوریؒ جیسے مجتہد کو پھانسی دے دی گئی۔ اس ناکامی نے علماء کو شدید مایوسی کا شکار کر دیا اور وہ دوبارہ حوزہ کی چار دیواری میں بند ہو گئے۔[1]

دوسرا مرحلہ: امام خمینیؒ اور فقہی پیراڈائم شفٹ

اس جمود کو توڑنے کے لیے امام خمینیؒ میدان میں آئے۔ انہوں نے مشروطیت کی غلطی سے سبق سیکھا اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ "بادشاہت کی اصلاح" ناممکن ہے؛ حل صرف "بادشاہت کا خاتمہ" اور "اسلامی حکومت کا قیام" ہے۔

امام خمینیؒ نے نجف اشرف میں اپنے فقہی دروس (کتاب البیع) کے دوران ولایتِ فقیہ کو ایک نئے اور انقلابی انداز میں پیش کیا۔ آپ کے نظریے کے بنیادی ستون درج ذیل تھے:

(الف) اسلام بطورِ نظامِ حکومت

امام خمینیؒ نے فرمایا کہ اسلام صرف عبادات کا مجموعہ نہیں ہے۔ آپ کا مشہور جملہ ہے: "الْإِسْلَامُ هُوَ الْحُكُومَةُ بِشُؤُونِهَا" "اسلام تمام تر حکومتی شئونات کے ساتھ حکومت ہی کا نام ہے۔"

---

[1] شیخ فرشی، تحلیلی بر نقش سیاسی عالمان شیعہ، صفحہ ۹۶۔

آپ نے استدلال پیش کیا کہ فقہ کا بہت بڑا حصہ (حدود، قصاص، دیات، مالیات، دفاع) حکومت کے بغیر معطل ہے۔ پس یا تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ اسلام ناقص ہے (معاذ اللہ)، یا پھر یہ ماننا پڑے گا کہ اسلام کا اپنا حکومتی ڈھانچہ موجود ہے۔[1]

(ب) ولایت بمقابلہ وکالت

جدید دور کے بعض مفکرین کا خیال تھا کہ فقیہ عوام کا "وکیل" ہوتا ہے۔ امام خمینیؒ نے اس تصور کو رد کیا۔ آپ نے واضح کیا کہ فقہاء کو یہ حق عوام نے نہیں دیا، بلکہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے دیا ہے۔

"الْفُقَهَاءُ أُمَنَاءُ الرُّسُلِ" (فقہاء رسولوں کے امین ہیں)۔

امین کا کام صرف مشورہ دینا نہیں، بلکہ امانت (دین و دنیا) کی حفاظت کرنا ہے۔ لہٰذا ولایتِ فقیہ کی جڑیں "الٰہی تنصیب" میں ہیں، نہ کہ عوامی وکالت میں۔ البتہ حکومت کی "تشکیل" اور "طاقت" کے لیے عوام کی تائید ضروری ہے۔

(ج) ولایتِ مطلقہ کا احیاء

امام خمینیؒ کا سب سے بڑا کارنامہ "ولایتِ مطلقہ" کے تصور کو زندہ کرنا تھا۔ ماضی میں کچھ فقہاء خیال کرتے تھے کہ فقیہ کی ولایت صرف "امورِ حسبیہ" (یتیموں اور بیواؤں کی کفالت) تک محدود ہے۔ امامؒ نے اس محدود سوچ کو توڑتے ہوئے فرمایا: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ علیہم السلام کو حکومت و سیاست کے میدان میں جو اختیارات حاصل تھے، وہ تمام کے تمام اختیارات (بغیر کسی کمی کے) جامع الشرائط فقیہ کو حاصل ہیں۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ فقیہ صرف شرعی مسائل تک محدود نہیں، بلکہ وہ جنگ، صلح، معیشت، خارجہ پالیسی اور ملکی انتظام کے تمام فیصلے کرنے کا "شرعی اختیار" رکھتا ہے۔ یہ کوئی نئی بدعت نہیں تھی، بلکہ

---

[1] امام خمینی، کتاب البیع، جلد ۲، صفحہ ۴۶۰۔

صاحبِ جواہرؒ اور محقق کرکیؒ کے اسی نظریے کا عملی اظہار تھا جسے زمانہ فراموش کر چکا تھا۔

نظریہ سے نظام تک: جمہوریہ اسلامی کا قیام

امام خمینیؒ کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے ولایتِ فقیہ کو صرف کتابوں میں نہیں رہنے دیا، بلکہ اسے ایک "آئین" کی شکل دی۔ انقلاب کے بعد جب "جمہوریہ اسلامی" کا ڈھانچہ تشکیل دیا گیا، تو امامؒ نے اس میں دو متضاد سمجھی جانے والی قوتوں کو یکجا کر دیا:

۱. الٰہی مشروعیت: ولایتِ فقیہ کے ذریعے، جو اللہ کے قانون کی پاسدار ہے۔

۲. عوامی مقبولیت: جمہوریت اور انتخابات کے ذریعے، جو عوام کی رائے کا احترام ہے۔

امامؒ کا موقف تھا کہ "حکومتِ اسلامی نہ استبدادی ہے اور نہ ہی مطلق العنان، بلکہ یہ 'مشروطہ' ہے؛ لیکن اس معنی میں نہیں کہ یہ اکثریت کی رائے کی پابند ہے، بلکہ اس معنی میں کہ یہ قرآن و سنت کے قوانین کی پابند ہے۔"

اس نظام میں ولی فقیہ "ڈکٹیٹر" نہیں ہوتا جو اپنی خواہش پر عمل کرے، بلکہ وہ "مجریٔ قانونِ الٰہی" ہوتا ہے۔ اگر وہ ایک لمحے کے لیے بھی اسلام کے دائرے سے باہر نکلے یا گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہو، تو وہ خود بخود معزول ہو جاتا ہے۔[1]

---

[1] امام خمینی، ولایت فقیہ، صفحہ ۳۳۔

باب چہارم: ولایتِ فقیہ؛ مفہوم، اقسام اور ماہیت

ولایت کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم

ا۔مادہ "ولی" کا لغوی تجزیہ

عربی زبان میں لفظ "ولایت"، مادہ "ول ی" سے مشتق ہے۔ لغت کے اعتبار سے "ولی" کا بنیادی معنی "قرب اور نزدیکی" ہے۔ جب دو چیزیں اس طرح متّصل ہوں کہ ان کے درمیان کوئی فاصلہ نہ ہو تو اسے "ولی" کہا جاتا ہے۔ اسی قرب کی مناسبت سے یہ لفظ مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے، جیسے: دوستی، مدد، محبت، اور پیروی۔

لیکن سیاسیات اور فقہ کی اصطلاح میں جب "ولایت" کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس کا مطلب "سرپرستی، تدبیر اور تصرف کا حق" ہوتا ہے۔ یعنی کسی شخص یا معاشرے کے امور کو سنبھالنا اور اس کی مصلحت کے مطابق فیصلے کرنا۔[1]

۲۔فقہی اصطلاح میں ولایتِ فقیہ

اصطلاح میں "ولایتِ فقیہ" سے مراد یہ ہے کہ زمانۂ غیبت میں اسلامی معاشرے کی مدیریت، سیاست اور نفاذِ احکام کی ذمہ داری ایک ایسے شخص کے سپرد ہو جو "فقیہ" (دین شناس)، "عادل" (باکردار) اور "مدبر" (سیاسی بصیرت رکھنے والا) ہو۔

---

[1] جوادی آملی، ولایت فقیہ ولایت فقاہت و عدالت، صفحہ ۹۱۔

یہ ولایت محض فتویٰ دینے تک محدود نہیں، بلکہ یہ معاشرے کے نظم و نسق اور حکومت کو چلانے کا نام ہے۔

ولایت کی اقسام

ولایت کے تصور کو درست طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی اقسام میں فرق کیا جائے، ورنہ انسان "شرک" یا "غلو" کے شبہات میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ ولایت کی بنیادی تین قسمیں ہیں:

۱۔ ولایتِ تکوینی

یہ وہ ولایت ہے جس کا تعلق کائنات کے نظام، تخلیق اور تدبیر سے ہے۔ یہ دراصل "علت اور معلول" کا رشتہ ہے۔ جس طرح سورج کو اپنی شعاعوں پر ولایت ہے یا انسانی روح کو اپنے جسم کے اعضاء پر کنٹرول حاصل ہے، اسے ولایتِ تکوینی کہتے ہیں۔

- خالق کی ولایت: حقیقی ولایتِ تکوینی صرف اللہ کے پاس ہے۔ "فَاللَّهُ هُوَ الْوَلِيُّ"۔ وہی کائنات کو کنٹرول کرتا ہے۔
- معصومین کی ولایت: اللہ کے اذن سے انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کو بھی کائنات میں تصرف کا حق ملتا ہے (جیسے جناب عیسیٰ ؑ کا مردوں کو زندہ کرنا)۔
- نوٹ: "ولی فقیہ" کے پاس یہ ولایتِ تکوینی ہرگز نہیں ہوتی۔ فقیہ کائنات کا کنٹرولر نہیں ہوتا۔

۲۔ ولایت بر تشریع

اس کا مطلب ہے "قانون بنانے کا حق"۔ چونکہ انسان کی حقیقت اور مصالح کو صرف خالق جانتا ہے،

اس لیے قانون سازی (شریعت بنانے) کا حق صرف اللہ کو ہے: "إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ"۔

پیغمبر اکرم ﷺ بھی اپنی طرف سے دین نہیں بنا سکتے تھے۔ لہٰذا، ولیٔ فقیہ کے پاس بھی "شریعت سازی" کا کوئی حق نہیں ہے۔ وہ قانون ساز نہیں بلکہ قانون شناس ہوتا ہے۔

۳۔ ولایتِ تشریعی

یہ وہ ولایت ہے جو "قانون کے دائرے میں" ہوتی ہے اور جس کا تعلق "انتظام و انصرام" سے ہے۔ یہ کوئی تکوینی تسلط نہیں بلکہ ایک "قانونی منصب" ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں:

1. محجورین پر ولایت: یعنی ان لوگوں کی سرپرستی جو اپنا بھلا برا نہیں سمجھ سکتے (جیسے یتیم بچے، پاگل، یا مردے)۔ فقہ کے کئی ابواب میں اس کا ذکر ہے۔
2. عقلاء پر ولایت: یعنی ایک باشعور معاشرے کو منظم کرنے کے لیے ان پر حکومت کرنا۔ "ولایتِ فقیہ" در حقیقت یہی قسم ہے۔

بعض لوگ غلط فہمی میں ولایتِ فقیہ کو "یتیموں والی ولایت" سمجھ لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کیا قوم یتیم ہے؟ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ ولایتِ فقیہ "محجورین پر قیمومیت" نہیں ہے، بلکہ یہ "امتِ مسلمہ کی سیاسی قیادت" ہے تاکہ معاشرہ بکھر نہ جائے۔[1]

ولایتِ فقیہ یا وکالتِ فقیہ؟ (ماہیت کا تعین)

عصرِ حاضر کا سب سے اہم سوال یہ ہے کہ کیا فقیہ عوام کا "وکیل" ہے یا "ولی"؟ یہ محض لفظی بحث نہیں،

---

[1] جوادی آملی، ولایت فقیہ، صفحہ ۹۲۔

بلکہ اس پر پورے سیاسی نظام کی عمارت کھڑی ہے۔

۱۔ وکالت اور ولایت میں بنیادی فرق

آیت اللہ جوادی آملی نے ان دونوں کے درمیان آٹھ بنیادی فرق بیان کیے ہیں، جن میں سے اہم ترین یہ ہیں:

۱. منبعِ اختیار: "وکالت" میں اختیار "نیچے سے اوپر" جاتا ہے (عوام وکیل کو پاور دیتے ہیں)، جبکہ "ولایت" میں اختیار "اوپر سے نیچے" آتا ہے (اللہ اور معصومؑ فقیہ کو منصب دیتے ہیں)۔

۲. معزولی کا حق: وکالت میں موکل (عوام) جب چاہیں وکیل کو معزول کر سکتے ہیں، چاہے وہ کتنا ہی لائق کیوں نہ ہو۔ لیکن ولایت میں جب تک فقیہ میں "شرائط" (علم و عدالت) موجود ہیں، عوام اسے شرعاً معزول نہیں کر سکتے، کیونکہ وہ اللہ کی طرف سے منصوب ہے۔

۳. دائرہ کار: وکیل صرف ان کاموں میں دخل دے سکتا ہے جو موکل کا حق ہوں (جیسے گھر بیچنا)۔ لیکن جو کام اللہ کے حق ہیں (جیسے حدود جاری کرنا، جہاد کا حکم دینا، بیت المال کی تقسیم)، ان میں عوام کسی کو وکیل نہیں بنا سکتے کیونکہ یہ عوام کی ملکیت ہی نہیں ہیں۔ یہ امور صرف "ولی" انجام دے سکتا ہے۔

۲۔ دلائل: فقیہ "ولی" ہے، "وکیل" نہیں

فقہاء نے ثابت کیا ہے کہ اسلامی حکومت کی ماہیت "وکالت" نہیں ہو سکتی، کیونکہ:

۱. جامعیتِ دین: اسلام نے معاشرے کے لیے جو قوانین (حدود، قصاص، جنگ، صلح) دیے ہیں، وہ عوام کی ذاتی ملکیت نہیں کہ وہ جسے چاہیں سونپ دیں۔ یہ "الٰہی ذمہ داریاں" ہیں جو

صرف اس شخص کو سونپی جا سکتی ہیں جسے شریعت نے نامزد کیا ہو۔

۲. تاریخی تسلسل: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امام علی علیہ السلام عوام کے وکیل نہیں تھے کہ عوام جب چاہتے انہیں ہٹا دیتے۔ وہ "ولی" تھے۔ غدیر میں "مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ" کہا گیا، نہ کہ "من کنت وکیله"۔ پس غیبت میں ان کا نائب بھی "ولی" ہی ہو گا۔

۳. مشروعیت کا بحران: اگر حکومت وکالت پر مبنی ہو تو جس نسل نے ووٹ دیا تھا، ان کے مرنے کے بعد حکومت ختم ہو جانی چاہیے (کیونکہ موکل کے مرنے سے وکالت ختم ہو جاتی ہے)۔ لیکن ولایت میں ایسا نہیں ہوتا؛ ولی کا منصب برقرار رہتا ہے جب تک وہ شرائط پر پورا اترے۔[1]

ولایتِ مطلقہ کا صحیح مفہوم

"ولایتِ مطلقہ" وہ اصطلاح ہے جس پر سب سے زیادہ اعتراضات کیے جاتے ہیں۔ مخالفین اسے "آمریت" اور "چنگیزیت" کے مترادف سمجھتے ہیں۔ اب ہم یہاں امام خمینیؒ کے نظریات کی روشنی میں اس کی حقیقت واضح کریں گے۔

ا۔ مطلقہ کا کیا مطلب نہیں ہے؟

"ولایتِ مطلقہ" کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ فقیہ قانون سے بالاتر ہے، یا وہ اپنی ذاتی خواہشات کے مطابق جو چاہے کر سکتا ہے۔

امام خمینیؒ فرماتے ہیں: "حکومتِ اسلامی نہ استبدادی ہے اور نہ ہی مطلق العنان، بلکہ یہ مشروطہ ہے... اس

[1] جوادی آملی، ولایت فقیہ، صفحہ ۲۵۱۔

معنی میں کہ حکمران قرآن و سنت کی شرائط کے پابند ہیں۔"[1]

اگر فقیہ ایک لمحے کے لیے بھی عدل یا تقویٰ سے ہٹ جائے، یا کسی کو ایک تھپڑ بھی ناحق مارے، تو وہ خود بخود ولایت سے معزول ہو جاتا ہے۔

۲۔ مطلقہ کا حقیقی مطلب

"مطلقہ" کا مطلب ہے: "حکومتی اختیارات میں وسعت اور جامعیت"۔

اس کے دو اہم پہلو ہیں:

۱. نسبی اطلاق: بعض علماء سمجھتے تھے کہ فقیہ کی ولایت صرف "امورِ حسبیہ" (یتیموں اور بیواؤں) تک محدود ہے۔ امام خمینیؒ نے فرمایا کہ ولایتِ فقیہ ان تک محدود نہیں، بلکہ یہ "مطلق" ہے، یعنی اس میں سیاست، معیشت، دفاع اور خارجہ پالیسی کے تمام امور شامل ہیں۔ فقیہ کے پاس وہ تمام حکومتی اختیارات ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امام علیہ السلام کے پاس تھے (سوائے ذاتی مقامات کے)۔

۲. تزاحم کا حل اور حکومتی احکام: جب معاشرے کی مصلحت اور کسی فرعی شرعی حکم میں ٹکراؤ (تزاحم) ہو جائے، تو ولی فقیہ کے پاس یہ اختیار ہے کہ وہ "مصلحتِ نظام" کو بچانے کے لیے وقتی طور پر فرعی حکم کو روک دے۔ مثلاً اگر حج پر جانے سے دشمن کو فائدہ پہنچ رہا ہو، تو ولی فقیہ حج کو وقتی طور پر روک سکتا ہے۔ اسے "ولایتِ مطلقہ" کہتے ہیں۔ یہ اختیار آمریت نہیں، بلکہ

[1] جوادی آملی، ولایت فقیہ، صفحہ ۳۳۔

"مصلحتِ عامہ" کی حفاظت کا نسخہ ہے۔[1]

۳۔ قانون اور ولایت میں ربط

ولی فقیہ قانونِ اساسی کے دائرے میں رہ کر کام کرتا ہے، لیکن ہنگامی حالات میں جب ملک کا وجود خطرے میں ہو، تو ولایتِ مطلقہ اسے یہ اختیار دیتی ہے کہ وہ آئینی ڈیڈ لاک کو توڑنے کے لیے "حکمِ حکومتی" جاری کرے۔ یہ اختیار دنیا کے ہر سربراہِ مملکت کے پاس کسی نہ کسی شکل میں موجود ہوتا ہے۔

ولایتِ فقیہ؛ براہینِ عقلیہ

اسلامی نظامِ فکر میں کسی بھی اصول کو ثابت کرنے کے دو راستے ہیں: ایک "نقل" (قرآن و حدیث) اور دوسرا "عقل" (منطقی استدلال)۔ ولایتِ فقیہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو نقل سے بھی ثابت ہے اور عقل سے بھی۔ بلکہ بعض علماء، جیسے امام خمینیؒ، فرماتے ہیں کہ "ولایتِ فقیہ کا تصور ہی ایسا ہے کہ جو اسے صحیح طرح سمجھ لے، وہ فوراً اس کی تصدیق کرلے گا اور اسے دلیل کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔"

عقلی دلائل اس لیے اہم ہیں کیونکہ یہ انسان کو ذہنی اطمینان دیتے ہیں اور یہ ثابت کرتے ہیں کہ "ولایتِ فقیہ کوئی جذباتی نعرہ نہیں" بلکہ ایک منطقی ضرورت ہے۔ ہم یہاں چار بنیادی عقلی دلائل کا جائزہ لیں گے جو فقہائے عظام نے پیش کیے ہیں۔

دلیلِ حکمت و لطف

اس کی ترتیب منطقی مقدمات کی صورت میں یوں ہے:

۱۔ مقدمہ اول: اللہ تعالیٰ حکیم ہے۔ اس نے انسان کو بے مقصد پیدا نہیں کیا اور نہ ہی اسے

---

[1] لک زایی، شریف؛ چیستی «ولایت مطلقہ فقیہ» در اندیشہ سیاسی امام خمینی (رہ)، صفحہ ۱۱تا۲۸۔

جنگل کے جانوروں کی طرح آزاد چھوڑ دیا ہے۔

۲. مقدمہ دوم: انسان کی انفرادی اور اجتماعی سعادت کے لیے ایک "قانون" (شریعت) کی ضرورت ہے جو اسے کمال تک پہنچائے۔ یہ قانون صرف اللہ بنا سکتا ہے۔

۳. مقدمہ سوم: صرف "قانون کا ہونا" کافی نہیں ہے، بلکہ اس قانون کو نافذ کرنے کے لیے ایک "مجری" کا ہونا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ اگر مجری نہ ہو تو قانون صرف کتابوں میں رہ جائے گا اور معاشرہ ہرج و مرج کا شکار ہو جائے گا۔

۴. مقدمہ چہارم: اللہ تعالیٰ نے انبیاء اور ائمہ معصومین علیہم السلام کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ قانون نافذ کریں۔ لیکن اب سوال یہ ہے کہ "عصرِ غیبت" میں کیا ہوگا؟

- کیا اللہ نے امت کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا ہے؟ (یہ اللہ کی حکمت اور لطف کے خلاف ہے)۔
- کیا اللہ راضی ہے کہ لوگ طاغوت اور ظالموں کی اطاعت کریں؟ (یہ اسلام کی روح کے خلاف ہے)۔

۵. نتیجہ: پس حکمتِ الٰہی کا تقاضا ہے کہ عصرِ غیبت میں بھی کوئی ایسا "سرپرست" موجود ہو جو قانونِ الٰہی کو نافذ کر سکے۔ اور چونکہ معصوم ظاہر نہیں ہے، لہٰذا عقل کہتی ہے کہ جو شخص صفات میں معصوم سے "سب سے زیادہ قریب" ہو، اسے یہ ذمہ داری ملنی چاہیے۔

وہ شخص کون ہے؟ جو "دین شناس" (فقیہ) ہو، "باکردار" (عادل) ہو، اور "باصلاحیت" (مدبر) ہو۔

پس عقل حکم لگاتی ہے کہ فقیہِ جامع الشرائط ہی وہ فرد ہے جسے اللہ نے معاشرے کی باگ ڈور سنبھالنے کے

لیے منتخب کیا ہے۔[1]

دلیلِ اصلح

یہ دلیل "عقلی اور انتظامی" نوعیت کی ہے:

۱. مقدمہ: ہر معاشرے کو چلانے کے لیے ایک حکومت ضروری ہے۔

۲. مقدمہ: ایک مثالی اسلامی حکومت وہ ہے جس کا سربراہ "معصوم" (امام) ہو، کیونکہ وہ غلطی نہیں کرتا۔

۳. مقدمہ: جب معصوم تک رسائی ممکن نہ ہو (جیسے غیبت کا زمانہ)، تو عقل کا فیصلہ یہ ہے کہ "آئیڈیل" کو چھوڑ کر "نیکسٹ بیسٹ آپشن" کی طرف جایا جائے۔ یعنی جو شخص معصوم سے سب سے زیادہ مشابہت رکھتا ہو۔

۴. تطبیق: معصوم کی تین بڑی خصوصیات ہیں:

- علمِ لدنی (مکمل علم) -> اس کا بدل "فقاہت اور اجتہاد" ہے۔
- عصمت (گناہ سے پاکی) -> اس کا بدل "عدالت اور تقویٰ" ہے۔
- تدبیر و شجاعت -> اس کا بدل "سیاسی بصیرت اور مدیریت" ہے۔

۵. نتیجہ: پس عقل کہتی ہے کہ معاشرے کی قیادت اس شخص کا حق ہے جس میں یہ تینوں صفات (علم، عدالت، تدبیر) موجود ہوں، اور وہ شخص "فقیہِ جامع الشرائط" ہی ہے۔ کسی جاہل، فاسق

[1] جوادی آملی، ولایت فقیہ، صفحہ ۱۵۹؛ مصباح یزدی، اختیارات ولی فقیہ، صفحہ ۸۱ تا ۹۵۔

یا صرف ڈاکٹر انجینئر کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا کیونکہ وہ "دین کا ماہر" نہیں ہے۔[1]

دلیلِ حسبہ اور برہانِ خلف

یہ دو الگ الگ لیکن انتہائی مضبوط استدلال ہیں:

۱۔ دلیلِ امورِ حسبیہ

فقہ میں کچھ امور ایسے ہیں جنہیں اللہ "کسی بھی حال میں زمین پر نہیں چھوڑنا چاہتا"۔ مثلاً یتیموں کی حفاظت، پاگلوں کی دیکھ بھال، اموال کا تحفظ، سرحدوں کی حفاظت، اور نظم و نسق۔ ان امور کو "امورِ حسبیہ" کہتے ہیں۔

فقہاء کا اتفاق ہے کہ اگر کوئی خاص ولی (باپ دادا) نہ ہو تو یہ ذمہ داری "فقیہ" پر آتی ہے۔

- استدلال: کیا ایک پورے ملک کا نظام، کروڑوں مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت، اور اسلام کا دفاع، "یتیم کے مال" سے کم اہم ہے؟ ہرگز نہیں۔ اگر یتیم کے مال کی حفاظت کے لیے فقیہ کی ولایت ضروری ہے، تو پوری امتِ مسلمہ کے نظام کی حفاظت کے لیے فقیہ کی ولایت "بدرجہ اولی" ضروری ہے۔

پس حکومتِ اسلامی "سب سے بڑا امرِ حسبیہ" ہے اور یہ فقیہ کی ذمہ داری ہے۔[2]

۲۔ برہانِ خُلف

یہ منطق کا ایک مشہور طریقہ ہے۔ اس میں ہم پہلے مخالف کی بات کو درست مان لیتے ہیں اور پھر دیکھتے

---

[1] حسین جوان آراستہ، مبانی حکومت اسلامی، صفحہ ۱۸۱۔

[2] احمد آذری، ولایت فقیہ، صفحہ ۶۷۔

ہیں کہ اس سے کیا خرابی پیدا ہوتی ہے:

- فرض کریں: "زمانۂ غیبت میں ولایتِ فقیہ نہیں ہونی چاہیے۔"
- نتیجہ: اگر ولایتِ فقیہ نہیں ہوگی، تو دو ہی راستے بچتے ہیں:

۱. یا تو مسلمان بغیر حکومت کے رہیں -> یہ "انارکی" اور "ہرج و مرج" ہے، جو عقلاً اور شرعاً حرام ہے۔

۲. یا پھر مسلمان کسی غیر فقیہ (طاغوت/سیکولر حکمران) کی اطاعت کریں -> یہ بھی قرآن کی رو سے حرام ہے "وَ لَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا"۔

- نتیجہ: چونکہ انارکی بھی حرام ہے اور طاغوت کی اطاعت بھی حرام ہے، لہٰذا واحد بچ جانے والا راستہ یہی ہے کہ "فقیہِ عادل" کی حکومت قائم کی جائے۔ یہی حق ہے۔

ولایتِ فقیہ؛ نقلی دلائل

قرآن کریم اور ولایت کا سیاسی مفہوم

قرآن کریم اللہ کی آخری کتاب ہے اور قیامت تک کے لیے ضابطۂ حیات ہے۔ قرآن کا عمومی اسلوب یہ ہے کہ وہ جزئیات کے بجائے "کلیات" اور بنیادی اصول بیان کرتا ہے۔ جس طرح قرآن میں یہ نہیں لکھا کہ "ظہر کی نماز کی چار رکعتیں ہیں" (یہ سنت کا کام ہے)، اسی طرح قرآن میں "ولایتِ فقیہ" کی اصطلاح تلاش کرنا عبث ہے۔ البتہ قرآن نے حکومت، سیاست، اطاعت اور ولایت کے جو "کلی اصول" بیان کیے ہیں، وہ اس نتیجے تک پہنچاتے ہیں کہ اسلامی معاشرے کی باگ ڈور صرف ایک "عادل، عالم اور الٰہی نمائندے" کے ہاتھ میں ہونی چاہیے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "فَإِذَا الْتَبَسَتْ عَلَيْكُمُ الْفِتَنُ كَقِطَعِ اللَّيْلِ الْمُظْلِمِ فَعَلَيْكُمْ بِالْقُرْآنِ" "جب فتنے اندھیری رات کے ٹکڑوں کی طرح تمہیں گھیر لیں، تو قرآن کا دامن تھام لو... یہ وہ رہنما ہے جو بہترین راستے کی طرف ہدایت کرتا ہے۔"[۱]

کیا یہ ممکن ہے کہ قرآن فرد کی ہدایت تو کرے لیکن معاشرے کو سیاسی سرگردانی اور طاغوت کے رحم و کرم پر چھوڑ دے؟ ہرگز نہیں۔

آیتِ اولویت اور حقیقتِ ولایت

قرآن کریم نے ولایت کا مرکز و محور ذاتِ باری تعالیٰ کو قرار دیا ہے اور پھر اس ولایت کا تسلسل انبیاء اور ائمہ علیہم السلام میں دکھایا ہے۔ سورہ احزاب میں ارشاد ہے: "النَّبِيُّ أَوْلَى بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ" "نبی مومنین کی جانوں پر خود ان سے زیادہ حق (اولویت) رکھتے ہیں۔"[۲]

استدلال: "اولویت" کا مطلب ہے کہ جب انسان کی ذاتی خواہش اور نبی (حاکمِ الٰہی) کے حکم میں ٹکراؤ ہو، تو نبی کا حکم مقدم ہوگا۔ یہی "حاکمیت" کی روح ہے۔ یہ حقِ حاکمیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ائمہ معصومین علیہم السلام کو منتقل ہوا اور زمانہ غیبت میں یہ اسی شخص کو حاصل ہوگا جو ان کا "نائبِ برحق" ہو۔ اگر فقیہ کو یہ "اولویت" (حکومتی اختیار) حاصل نہ ہو تو وہ معاشرے میں نظم و نسق قائم نہیں کر سکتا۔

طاغوت کے انکار کا حکم

قرآن کریم نے ایک طرف اطاعتِ الٰہی کا حکم دیا ہے اور دوسری طرف "طاغوت" (غیر الٰہی حاکم) کی اطاعت کو حرام قرار دیا ہے: "يُرِيدُونَ أَن يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَن

---

[۱] کلینی، اصول کافی، جلد ۲، صفحہ ۵۹۹۔

[۲] سورہ احزاب: ۶۔

يَكْفُرُوا بِهِ" "یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اپنے فیصلے طاغوت کے پاس لے جائیں، حالانکہ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس کا انکار (کفر) کریں۔"[۱]

استدلال: جب طاغوت کی طرف جانا حرام ہے، اور بغیر حکومت کے رہنا بھی ممکن نہیں (کیونکہ یہ ہرج و مرج ہے)، تو پھر تیسرا راستہ کیا ہے؟ وہ راستہ یہی ہے کہ ایسے حاکم کی طرف رجوع کیا جائے جو "حکمِ الٰہی" کے مطابق فیصلہ کرے، اور وہ "فقیہِ عادل" ہی ہو سکتا ہے۔ پس ولایتِ فقیہ، طاغوت کے انکار کا لازمی تقاضا ہے۔

اولو الامر کی اطاعت

"أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ" اس آیت میں "اولو الامر" سے مراد بالاصالۃ تو معصومین علیہم السلام ہیں، لیکن زمانہ غیبت میں "اولو الامر" کا مصداق وہ فقہاء ہیں جو ائمہ علیہم السلام کے نائب ہیں۔ کیونکہ اللہ امت کو بغیر سرپرست کے نہیں چھوڑ سکتا۔

روایات اور احادیث (فقہاء کی نیابتِ عامہ)

احادیث کے ذخیرے میں ایسی کثیر روایات موجود ہیں جو فقہاء کو انبیاء علیہم السلام کا وارث، امین قرار دیتی ہیں۔ ان روایات کی مجموعی دلالت اس بات پر قطعی ہے کہ ائمہ علیہم السلام نے اپنی غیبت کے دوران فقہاء کو زمامِ کار سونپی ہے۔

۱۔ مقبولہ عمر بن حنظلہ (سب سے مضبوط دلیل)

یہ روایت ولایتِ فقیہ کی "نصِ جلی" (واضح دلیل) سمجھی جاتی ہے۔ عمر بن حنظلہ نے امام صادق علیہ السلام سے

[۱] سورہ نساء: ۶۰۔

پوچھا کہ اگر شیعوں میں کوئی جھگڑا ہو جائے تو کیا وہ حاکمِ وقت (طاغوت) کی طرف رجوع کریں؟ امام علیہ السلام نے سختی سے منع کیا اور فرمایا: "يُنْظُرانِ اِلى مَنْ كانَ مِنْكُمْ، قَد رَوى حَديثِنا... فَلْيَرْضَوْا بِهِ حَكَماً فَإِنِّي قَدْ جَعَلْتُهُ عَلَيْكُمْ حاكِماً" "وہ اپنے درمیان ایسے شخص کو تلاش کریں جو ہماری حدیث روایت کرتا ہو، ہمارے حلال و حرام میں صاحبِ نظر (مجتہد) ہو اور ہمارے احکام کو پہچانتا ہو... پس انہیں چاہیے کہ اسے اپنا حَکم (فیصلہ کرنے والا) ماننے پر راضی ہو جائیں، کیونکہ میں نے اسے تم پر حاکم مقرر کیا ہے۔"[۱]

امام خمینیؒ کا استدلال: امام خمینیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں امام علیہ السلام نے صرف "قاضی" کا لفظ استعمال نہیں کیا، بلکہ "حاکماً" (حاکم) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ حاکم کا لفظ قضاوت سے زیادہ وسیع ہے اور یہ "ولایت و حکومت" کو شامل ہے۔ پھر امام علیہ السلام نے فرمایا کہ "جو اس کا حکم رد کرے گا، اس نے ہمارا حکم رد کیا اور جس نے ہمارا حکم رد کیا اس نے اللہ کا حکم رد کیا اور یہ شرک کے برابر ہے۔" یہ جملے اس فقیہ کی "ریاستِ مطلقہ" اور "وجوبِ اطاعت" پر واضح دلیل ہیں۔[۲]

۲۔ توقیعِ مبارک (امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کا فرمان)

اسحاق بن یعقوب نے امامِ عصر ارواحنا فداہ کو خط لکھا کہ غیبت کے دوران پیش آنے والے نئے مسائل (الحوادث الواقعۃ) میں ہم کیا کریں؟ امام ارواحنا فداہ نے جواب میں تحریر فرمایا: "وَ أَمَّا الْحَوَادِثُ الْوَاقِعَةُ فَارْجِعُوا فِيهَا إِلَى رُوَاةِ حَدِيثِنَا فَإِنَّهُمْ حُجَّتِي عَلَيْكُمْ وَ أَنَا حُجَّةُ اللَّهِ عَلَيْهِمْ" "اور جو نئے حوادث (سیاسی و سماجی مسائل) پیش آئیں، ان میں ہماری حدیثوں کے راویوں (فقہاء) کی طرف

---

[۱] حر عاملی، وسائل الشیعہ، جلد ۱۸، باب ۱۱۔

[۲] امام خمینی، ولایت فقیہ، صفحہ ۸۱۔

رجوع کرو، کیونکہ وہ تم پر میری حجت ہیں اور میں ان پر اللہ کی حجت ہوں۔"[۱]

استدلال: یہاں "حوادثِ واقعہ" سے مراد صرف شرعی مسائل (نماز روزے کے مسائل) نہیں ہیں، کیونکہ وہ تو پہلے سے کتابوں میں موجود تھے۔ "حوادث" سے مراد وہ نئے سیاسی، سماجی اور عسکری حالات ہیں جو معاشرے کو پیش آتے ہیں۔ ان معاملات میں امام عجل اللہ فرجہ نے فقہاء کو اپنی "حجت" قرار دیا ہے۔ حجت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے ان کی بات مانی تو گویا میری بات مانی۔ یہ فقہاء کی ولایت پر نص ہے۔ [۲]

۳۔ دیگر اہم روایات

اس کے علاوہ بھی متعدّد روایات ہیں جو اس منصب کی تائید کرتی ہیں:

- "اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ": "علماء انبیاء کے وارث ہیں۔" (انبیاء کا ورثہ صرف علم نہیں، بلکہ ان کا منصب اور ذمہ داریاں بھی ہیں)۔[۳]
- "اَلْفُقَهَاءُ أُمَنَاءُ الرُّسُلِ": "فقہاء رسولوں کے امین ہیں۔" (امین کو امانت کی حفاظت کے لیے اقتدار درکار ہوتا ہے)۔[۴]
- "اَلْعُلَمَاءُ حُكَّامٌ عَلَى الْمُلُوكِ": "علماء بادشاہوں پر حاکم ہیں۔" (یعنی اصل اقتدار

---

[۱] صدوقؒ، کمال الدین، جلد ۲، صفحہ ۴۸۳۔
[۲] مصطفیٰ جعفر پیشہ، مبنای ولایت فقیہ در روایات، صفحہ ۸۹۱۔
[۳] کلینی، کافی، جلد ۱ صفحہ ۳۴۔
[۴] کلینی، کافی، جلد ۱ صفحہ ۴۶۔

علمائے دین کا ہے، بادشاہوں کا نہیں)۔[1]

- "اللَّهُمَّ ارْحَمْ خُلَفَائِي": رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علماء کو اپنا "خلیفہ" (جانشین) قرار دیا ہے۔[2]

اہلیت پر مبنی حکمرانی کا اسلامی ماڈل

ولایتِ فقیہ در حقیقت "اہلیت پر مبنی حکمرانی" (میرٹ کی حکمرانی) کا دوسرا نام ہے۔ اس نظام میں عہدے وراثت، دولت یا قبیلے کی بنیاد پر نہیں ملتے بلکہ اہلیت کی بنیاد پر دیے جاتے ہیں۔ ولایتِ فقیہ کا نظام دراصل "اہل افراد کے انتخاب" کا نظام ہے، جس میں وراثت، دولت یا قبیلے کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔

۱۔ قرآن کا معیار

قرآن میں حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: "اجْعَلْنِي عَلَى خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ" "مجھے زمین کے خزانوں (معیشت) پر مقرر کر دیں، میں حفاظت کرنے والا (امین) اور جاننے والا (ماہر) ہوں۔"[3]

یہ آیت بتاتی ہے کہ عہدہ اسی کو مانگنا چاہیے یا ملنا چاہیے جو "امین" بھی ہو اور "علیم" (Expert) بھی۔

اسی طرح حضرت طالوتؑ کے قصے میں بنی اسرائیل نے اعتراض کیا کہ وہ غریب ہیں، تو نبی نے فرمایا: "إِنَّ

---

[1] مجلسی، بحار الأنوار، جلد ۱، صفحہ ۱۸۳۔

[2] حر عاملی، وسائل الشیعة، جلد ۲۷، صفحہ ۹۲۔

[3] سورہ یوسف: ۵۵۔

اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ" "اللہ نے اسے تم پر چن لیا ہے اور اسے علم اور جسمانی طاقت (جنگی صلاحیت) میں وسعت دی ہے۔"

اس سے ثابت ہوا کہ قیادت کا معیار "مال و دولت" نہیں بلکہ "علمی اور انتظامی صلاحیت" ہے۔

۲۔ سیرتِ معصومین علیہم السلام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت میں "اہلیت پر مبنی حکمرانی" کی سب سے بڑی مثال ابوذر غفاریؓ کا واقعہ ہے۔ ابوذرؓ تقویٰ اور زہد میں اتنے بلند تھے کہ نبیؐ نے فرمایا: "آسمان کے نیچے ابوذر سے زیادہ سچا کوئی نہیں۔"

لیکن جب ابوذرؓ نے ایک عہدہ مانگا تو آپؐ نے فرمایا:

"اے ابوذر! میں تم سے محبت کرتا ہوں، لیکن تم کمزور (ضعیف) ہو (انتظامی لحاظ سے)۔ تم کبھی دو آدمیوں پر بھی امیر نہ بننا اور نہ یتیم کے مال کی ولایت سنبھالنا۔"[1]

اس حدیث سے یہ سنہری اصول نکلتا ہے کہ "صرف نیک ہونا حکمرانی کے لیے کافی نہیں ہے۔" ایک شخص تہجد گزار ہو سکتا ہے، لیکن اگر وہ کمزور ہے اور فیصلے نہیں کر سکتا، تو وہ نظام کو تباہ کر دے گا۔

امیر المومنین علیہ السلام نے مالک اشتر کو خط میں لکھا کہ عہدے داروں کو چنتے وقت ان خصوصیات کا خیال رکھو:

- تجربہ کار: (اہلِ تجربہ ہوں)۔
- باکردار: (اہلِ حیاء ہوں)۔
- خاندانی شرافت: (صالح خاندان سے ہوں، کیونکہ ان میں لالچ کم ہوتی ہے)۔

---

[1] مجلسی، بحار الانوار، جلد ج ۲۲، ص ۴۰۶ و ج ۷۲، ص ۳۴۔

- سابقہ ریکارڈ: (اسلام میں پیش قدمی رکھتے ہوں)۔

آپ نے فرمایا کہ خوشامد اور سفارش کی بنیاد پر عہدے نہ دینا، کیونکہ یہ خیانت کی جڑ ہے۔[۱]

رہبری کے لیے شرائط کی ضرورت

قیادت کے لیے سخت ترین معیار

اسلام کا نظامِ حکومت "شخصی" نہیں بلکہ "مکتبی" ہے۔ اس میں حکمران کو کھلی چھٹی نہیں ہوتی کہ وہ جو چاہے کرے، بلکہ اسے ایک سخت ترین "اہلیت کے معیار" پر پورا اترنا ہوتا ہے۔ امام خمینیؒ فرماتے ہیں: "اسلام میں رہبر کے لیے جو شرائط ہیں، وہ دنیا کے کسی بھی دوسرے نظام سے زیادہ سخت اور دقیق ہیں۔ اگر فقیہ ایک لمحے کے لیے بھی ان شرائط سے ہٹ جائے تو وہ خود بخود معزول ہو جاتا ہے۔"

یہ شرائط اس لیے رکھی گئی ہیں تاکہ معاشرے کی باگ ڈور کسی نااہل، جاہل یا ظالم کے ہاتھ میں نہ چلی جائے، کیونکہ حضرت علی علیہ السلام کا فرمان ہے: "لَا يَنبَغِي أَنْ يَكُونَ الْوَالِي... الْجَاهِلَ فَيُضِلَّهُمْ بِجَهْلِهِ" "یہ مناسب نہیں کہ مسلمانوں کا حاکم جاہل ہو جو اپنی جہالت سے انہیں گمراہ کر دے۔"[۲]

اسلامی نظامِ سیاست کی بنیاد "شخصیت پرستی" پر نہیں بلکہ "اصول پرستی" اور "اہلیت" پر استوار ہے۔ چونکہ اس نظام میں ولی فقیہ کے پاس اختیارات وسیع ہیں (جیسا کہ ولایتِ مطلقہ کی بحث میں گزرا)، لہٰذا عقل اور نقل کا تقاضا ہے کہ اس منصب پر فائز ہونے والے شخص کے لیے شرائط بھی اتنی ہی کڑی اور سخت

---

[۱] نہج البلاغہ، نامہ ۵۳۔

[۲] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۳۱۔

ہوں تاکہ اقتدار کا غلط استعمال نہ ہو سکے۔ ایک اسلامی حکومت میں حکمران محض "سربراہ" نہیں ہوتا بلکہ وہ دین کا محافظ اور امت کا امین ہوتا ہے۔

شرطِ اول: فقاہت اور اجتہادِ مطلق (علمی صلاحیت)

۱۔ اجتہاد کی نوعیت: "متجزی" یا "مطلق"؟

ولی فقیہ کے لیے محض "عالم" ہونا کافی نہیں، بلکہ اسے "مجتہدِ مطلق" ہونا چاہیے۔ اسلام ایک منسجم نظام ہے جس میں "سیاست عینِ دیانت ہے"۔ لہٰذا، اسلام کو سمجھنے والا وہ شخص رہبر بن سکتا ہے جو دین کے تمام پہلوؤں (عبادات، معاملات، سیاسیات، اقتصادیات) پر گہری نظر رکھتا ہو۔

- مجتہدِ متجزی: وہ شخص جو فقہ کے کچھ ابواب (مثلاً نماز روزہ) میں تو اجتہاد کر سکتا ہو لیکن سیاسی اور اجتماعی مسائل میں تقلید کرتا ہو یا گہری سمجھ نہ رکھتا ہو، وہ رہبر بننے کا اہل نہیں ہے۔
- مجتہدِ مطلق: رہبر کے لیے ضروری ہے کہ وہ "صدر و ساقۂ اسلام" (اسلام کی جڑ اور شاخوں) کو استدلال کے ساتھ جانتا ہو۔ اسے قرآن، سنت اور روایات پر اتنا عبور ہو کہ وہ پیچیدہ ترین جدید مسائل کا حل دین سے نکال سکے۔ اگر کوئی شخص فقہ کے کسی ایک گوشے میں کمزور ہے، تو وہ "مصدرِ ولایت" نہیں بن سکتا۔[1]

۲۔ کیا "مرجعیت" شرط ہے؟

ماضی میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ولی فقیہ کو روایتی معنوں میں "مرجعِ تقلید" ہونا چاہیے (یعنی جس کا رسالۂ عملیہ چھپا ہو اور لوگ تقلید کرتے ہوں)۔ لیکن نظر ثانی کے دوران امام خمینیؒ نے اس شرط کو ختم کر دیا۔

---

[1] جوادی آملی، ولایت فقیہ (ولایت فقاہت و عدالت)، صفحہ ۹۲۔

امام خمینیؒ نے اپنے تاریخی مکتوب میں فرمایا:

"میں شروع سے اس بات کا قائل تھا کہ مرجعیت شرط نہیں ہے۔ مجتہدِ عادل، جسے خبرگان منتخب کر لیں، وہ ولایت کے لیے کافی ہے۔ اگر ہم مرجعیت کی شرط رکھیں تو شاید مستقبل میں ہمیں کوئی موزوں رہبر نہ مل سکے۔"

اس کی فقہی وجہ یہ ہے کہ "مرجعیت" کا تعلق فردی مسائل بتانے سے ہے، جبکہ "ولایت" کا تعلق نظام چلانے سے ہے۔ شافعی عالم "ابنِ زکریا نووی" اور "شربینی" نے بھی لکھا ہے کہ امام (حاکم) کے لیے ضروری ہے کہ وہ "مجتہد" ہو تاکہ حوادث میں دوسروں کا محتاج نہ ہو، لیکن اس کا "مجتہدِ مطلق" (ہر جزوی مسئلے میں) ہونا ضروری نہیں، بلکہ حکومتی امور میں اجتہاد کافی ہے۔[1]

شرطِ دوم: عدالت اور تقویٰ (اخلاقی کنٹرول)

۱۔ عدالت کا مفہوم: ظاہر اور باطن

رہبر کے لیے دوسری ناگزیر شرط "عدالت" ہے۔ فقہی اصطلاح میں عدالت ایک ایسی "کیفیتِ نفسانی" (ملکہ) ہے جو انسان کو گناہِ کبیرہ کے ارتکاب اور گناہِ صغیرہ پر اصرار سے روکتی ہے۔ لیکن ولی فقیہ کے لیے "عدالت" کا معیار عام پیش نماز سے کہیں زیادہ بلند ہے۔

فقیہِ جامع الشرائط وہ ہے جو:

- عقلِ نظری میں علمِ دین کا ماہر ہو۔
- عقلِ عملی میں اپنی خواہشات کا اسیر نہ ہو۔

(۱) مصطفیٰ ناصحی، ولایت فقیہ و تفکیک قوا، ص ۲۱۶۔

اگر کوئی شخص اپنے اندرونی بتوں (ہوائے نفس، جاہ طلبی، خود پسندی) کو نہیں توڑ سکا، تو وہ معاشرے کی اصلاح نہیں کر سکتا۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے: "أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ" "کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا خدا بنا لیا ہے؟"[۱]

ایسا شخص جس کے دل میں "ہوائے نفس کا بت کدہ" آباد ہو، وہ صلاحیتِ رہبری نہیں رکھتا۔ فقیہ کو چاہیے کہ وہ نہ صرف فتاویٰ دے، بلکہ خود سب سے پہلے ان پر عمل کرے۔ اگر وہ حکم دے اور خود عمل نہ کرے تو وہ عادل نہیں رہتا۔[۲]

۲۔ ظالم کی امامت کا بطلان

قرآن اور حدیث میں ظالم اور جائز شخص کی حکمرانی کو سختی سے مسترد کیا گیا ہے۔

- حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنی ذریت کے لیے امامت مانگی تو اللہ نے فرمایا: "لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ" "میرا عہد (امامت) ظالموں تک نہیں پہنچتا۔"

- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "امامت اس کے لیے سزاوار نہیں مگر وہ جو تین صفات رکھتا ہو: ایسی پارسائی (ورع) جو اسے معصیت سے روکے، ایسا حلم جو غضب کو کنٹرول کرے، اور رعایا پر ایسی شفقت جیسے مہربان باپ کی۔"

امام خمینیؒ فرماتے ہیں: "اگر سربراہ عادل نہ ہو تو وہ مسلمانوں کے حقوق ادا نہیں کرے گا، ٹیکس کا غلط استعمال کرے گا اور اپنے رشتہ داروں کو نوازے گا، جو نظام کی تباہی کا باعث ہے۔"[۳]

---

[۱] سورہ جاثیہ: ۲۳۔

[۲] جوادی آملی، ولایت فقیہ، صفحہ ۲۲۵۔

[۳] مصطفیٰ ناصحی، ولایت فقیہ و تفکیکِ قوا، صفحہ ۲۰۶۔

شرطِ سوم: مدیریت، تدبیر اور سیاسی بصیرت (انتظامی صلاحیت)

یہ وہ شرط ہے جو ایک "عالم" کو "رہبر" میں تبدیل کرتی ہے۔ صرف علم اور تقویٰ کافی نہیں، بلکہ "آگاہی بہ زمان" اور "مدیریت" لازمی ہے۔

۱۔ سیاسی بصیرت اور زمانہ شناسی

اس کا مطلب یہ ہے کہ رہبر کو دنیا کے سیاسی حالات، بین الاقوامی سازشوں، دوست اور دشمن کی پہچان، اور ٹیکنالوجی و معاشیات کے جدید تقاضوں کا علم ہونا چاہیے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: "وَمَنْ عَرَفَ الْأَيَّامَ لَمْ يَغْفُلْ مِنَ الِاسْتِعْدَادِ" "جو زمانے (کے حالات) کو پہچانتا ہے، وہ (دشمن کے حملے کے لیے) تیاری سے غافل نہیں رہتا۔"[1]

۲۔ ایک عبرت ناک تاریخی مثال

آیت اللہ جوادی آملی نے اس نکتے کی وضاحت کے لیے ایک چشم کشا واقعہ نقل کیا ہے:

شاہ کے دور میں جب اسلام اور کفر کی جنگ جاری تھی، تو ایک بہت بڑے فقیہ اور عالم موجود تھے، جن کے علم اور تقویٰ میں کوئی شک نہ تھا۔ لوگ ان کے پاس گئے کہ کچھ رہنمائی کریں، لیکن وہ بزرگ اس وقت "بحار الانوار" کی کتاب کھولے "تقیہ" کے ابواب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ وہ علم میں "ادق" تھے، لیکن "مدیر اور مدبر" نہیں تھے۔ انہیں یہ شعور نہیں تھا کہ جب ہزاروں لوگ اسلام کے لیے کٹ رہے ہوں تو تقیہ نہیں کیا جاتا، بلکہ قیام کیا جاتا ہے۔

ایسا شخص جو علم کا سمندر ہو لیکن یہ نہ جانتا ہو کہ "دشمن کب حملہ آور ہے" اور "قوم کی مصلحت کس فیصلے میں

---

[1] کلینی، اصول کافی، جلد ۱، صفحہ ۲۶۔

ہے"، وہ رہبر نہیں بن سکتا۔ رہبر کو امام خمینیؒ جیسا ہونا چاہیے جو حکومتِ نظامی (مارشل لاء) کے اعلان پر ڈرنے کے بجائے عوام سے کہے کہ "باہر نکلو اور کرفیو توڑ دو!"۔ یہ جرات اور تدبیر فقاہت کا لازمی جزو ہے۔[1]

۳۔ کفایت اور کارکردگی

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: "مَنْ أَحْسَنَ الْكِفَايَةَ اسْتَحَقَّ الْوِلَايَةَ" "جو انتظام چلانے کی اچھی صلاحیت (کفایت) رکھتا ہو، وہی حکمرانی کا مستحق ہے۔"[2]

رہبر کے اندر یہ صلاحیت ہونی چاہیے کہ وہ بحرانوں میں درست فیصلہ کر سکے، مختلف ریاستی اداروں میں توازن رکھ سکے اور ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کر سکے۔

---

[1] جوادی آملی، ولایت فقیہ، صفحہ ۲۰۶۔

[2] آمدی، غرر الحکم جلد ۲ صفحہ ۳۹۱۔

باب پنجم: حکومت کی مشروعیت؛ الٰہی یا عوامی؟

سیاسیات کے میدان میں جب بھی اقتدار اور حکومت کی بات ہوتی ہے، تو سب سے پہلا اور بنیادی سوال جو ہر ذی شعور انسان کے ذہن میں ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ: "آخر فلاں شخص کو مجھ پر حکم چلانے کا حق کس نے دیا ہے؟"

میں ایک آزاد انسان ہوں، میری اپنی عقل اور ارادہ ہے، پھر میں کسی دوسرے انسان کی اطاعت کیوں کروں؟ وہ کون سی بنیاد ہے جو "طاقت" کو "اقتدار" میں بدل دیتی ہے؟ اور جو "جبر" کو "قانون" کا درجہ عطا کرتی ہے؟

سیاسی فلسفے میں اسی "جواز" اور "اخلاقی بنیاد" کو "مشروعیت" کہا جاتا ہے۔ یہ وہ زنجیر ہے جو حکمران کے "حکم" اور رعایا کی "اطاعت" کو آپس میں جوڑتی ہے۔ اگر یہ زنجیر ٹوٹ جائے تو حکومت "غاصبانہ" ہو جاتی ہے اور اس کے احکامات کی حیثیت "بدمعاشی" سے زیادہ نہیں رہتی۔

اسلامی نظامِ حکومت میں یہ بحث اس لیے بھی زیادہ اہم ہے کیونکہ یہاں حکمرانی کا دعویٰ صرف دنیوی انتظام تک محدود نہیں، بلکہ یہ "دینی اطاعت" اور "آخرت کی فلاح" کا دعویدار بھی ہے۔ لہٰذا، ہمیں سب سے پہلے یہ سمجھنا ہوگا کہ مشروعیت کا مفہوم مغرب کی نظر میں کیا ہے اور اسلام کی نظر میں کیا؟

- لغوی معنی: لفظ "مشروعیت"، "شریعت" اور "شرع" کے مادے سے ہے، جس کا مطلب ہے "راستہ دکھانا" یا "قانون کے مطابق ہونا"۔
- سیاسی اصطلاح: مغربی سیاسیات (مثلاً میکس ویبر کی تعریف) میں مشروعیت کا مطلب "حقانیت" نہیں، بلکہ "مقبولیت" ہے۔ یعنی اگر عوام کی اکثریت کسی حکومت کو مان لے اور

اس کے خلاف بغاوت نہ کرے، تو وہ حکومت "مشروع" ہے، چاہے وہ حکومت کتنی ہی ظالم، فاسق یا غیر اخلاقی کیوں نہ ہو۔ یہاں معیار "حق" نہیں، "رائے عامہ" ہے۔

- اسلامی و فقہی اصطلاح: اسلام میں مشروعیت کا مفہوم مغرب سے بالکل جدا ہے۔ یہاں مشروعیت کا مطلب ہے "حقانیت" اور "قانونی ہونا" از روئے شریعت۔

اسلامی نقطہ نظر سے سوال یہ نہیں ہے کہ "کتنے لوگ راضی ہیں؟" بلکہ سوال یہ ہے کہ "کیا اللہ اور اس کا قانون اس حاکم سے راضی ہے؟" اگر پوری دنیا بھی یزید یا فرعون کی حکومت پر راضی ہو جائے اور اسے ووٹ دیدے، تب بھی اسلام کی نظر میں وہ حکومت "نامشروع" اور "طاغوت" ہی رہے گی، کیونکہ اسے "اذنِ الٰہی" حاصل نہیں ہے۔ لہٰذا اسلام میں مشروعیت "حق" ہونے کا نام ہے، محض "مان لیے جانے" کا نام نہیں۔

حاکمیت کا بحران اور توحیدِ ربوبی

اسلامی فلسفۂ سیاست کی بنیاد "توحیدِ ربوبی" پر ہے۔ کائنات کا خالق، مالک اور مدبر صرف اللہ ہے۔ "إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ" "حکمرانی کا حق صرف اللہ کو ہے۔"

چونکہ انسان اللہ کی مخلوق اور مملوک ہیں، لہٰذا کسی انسان کو یہ ذاتی حق نہیں پہنچتا کہ وہ دوسرے انسانوں پر اپنی مرضی مسلط کرے۔ نہ بادشاہ کو یہ حق ہے، نہ صدر کو، اور نہ ہی ۵۱ فیصد اکثریت کو یہ حق ہے کہ وہ ۴۹ فیصد پر اپنی رائے تھوپے۔

نتیجتاً: دنیا میں ہر حکومت بنیادی طور پر "غاصبانہ" ہے، سوائے اس حکومت کے جسے خود "مالکِ کائنات" (اللہ) نے اجازت دی ہو۔ لہٰذا، مشروعیت کا واحد سرچشمہ "اذنِ الٰہی" ہے۔

نظریۂ انتصاب: دلائل اور مبانی

شیعہ مکتبِ فکر کے فقہاء اور متکلّمین کی اکثریت (المشہور) اس بات کی قائل ہے کہ زمانۂ غیبت میں ولی فقیہ کی مشروعیت کا منبع "عوام کا ووٹ" نہیں، بلکہ "الٰہی تنصیب" ہے۔ اسے "نظریۂ انتصاب" کہتے ہیں۔ اس نظریے کے تحت، ولی فقیہ کو اللہ نے (معصومین علیہم السلام کے ذریعے) نصب کیا ہے۔

۱۔ انتصاب کا مفہوم: نصبِ عام

یہاں انتصاب سے مراد یہ نہیں کہ اللہ نے نام لے کر کہا ہو کہ "فلاں بن فلاں کو میں نے حاکم بنایا" (جیسے ائمہ علیہم السلام کے بارے میں نصِ خاص ہے)۔ بلکہ زمانہ غیبت کے لیے "نصبِ عام" کا طریقہ اپنایا گیا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ امامِ معصوم علیہ السلام نے کسی خاص فرد کا نام لینے کے بجائے "اوصاف اور معیار" بیان کر دیے ہیں اور فرمایا ہے کہ "جو شخص بھی ان صفات (فقاہت، عدالت، تدبیر) کا حامل ہو، وہ میری طرف سے تم پر حاکم ہے"۔

مقبولہ عمر بن حنظلہ میں امام صادق علیہ السلام کا یہ جملہ انتہائی اہم ہے: "فَإِنِّي قَدْ جَعَلْتُهُ عَلَيْكُمْ حَاكِماً" "پس میں نے اس (صاحبِ صفات فقیہ) کو تم پر حاکم قرار دیا ہے (بنایا ہے)۔"

یہ جملہ "انشاء" ہے، محض خبر نہیں ہے۔ یعنی امام علیہ السلام اپنی ولایتِ کلیہ کے اختیار کو استعمال کرتے ہوئے فقیہ کو منصب عطا کر رہے ہیں۔

۲۔ عوام کا کردار: کشف اور تولیدِ قدرت

اگر ولی فقیہ کو اللہ نے نصب کیا ہے، تو پھر انتخابات اور "مجلسِ خبرگان" کا کیا کام ہے؟ کیا عوام کا کوئی کردار نہیں؟

اس نظریے کے مطابق، عوام کا کردار "مشروعیت دینے" کا نہیں، بلکہ "تشخیص اور کارکردگی" کا ہے۔

۱. کشف : چونکہ اللہ نے نام نہیں بتایا، بلکہ صفات بتائی ہیں، لہٰذا عوام (یا ان کے نمائندوں/خبرگان) کی ذمہ داری ہے کہ وہ ڈھونڈیں کہ اس وقت معاشرے میں کون سا فقیہ ان صفات پر پورا اترتا ہے؟ جب وہ اسے ڈھونڈ کر منتخب کرتے ہیں، تو وہ اسے "حاکم بناتے نہیں" بلکہ یہ اعلان کرتے ہیں کہ "ہم نے اللہ کے بنائے ہوئے حاکم کو پہچان لیا ہے"۔

۲. تولیدِ قدرت : ولی فقیہ کے پاس "شرعی حق" تو اللہ کی طرف سے ہوتا ہے، لیکن حکومت کرنے کی "طاقت" عوام کی حمایت سے آتی ہے۔ حضرت علی علیہ السلام ۲۵ سال تک "امامِ برحق" تھے (اللہ کی طرف سے)، لیکن "حاکمِ وقت" نہیں تھے، کیونکہ عوام نے ساتھ نہیں دیا تھا۔ جب عوام آئے، تو آپ کو اقتدار ملا، مشروعیت نہیں (وہ تو پہلے سے تھی)۔

حاکمیت کا "حق" آسمان سے آتا ہے، اور حاکمیت کی "کرسی" زمین والے فراہم کرتے ہیں۔

نظریۂ انتخاب کا تنقیدی جائزہ

عصرِ حاضر میں بعض علماء (جیسے مرحوم آیت اللہ منتظری، نعمت اللہ صالحی نجف آبادی وغیرہ) نے ایک متبادل نظریہ پیش کیا جسے "نظریہ انتخاب" کہا جاتا ہے۔ اس نظریے کے مطابق:

"اللہ نے فقیہ کو صرف نامزد کیا ہے یا اس کی صلاحیت بیان کی ہے، لیکن اسے حاکم بنانے کا اختیار عوام کو دیا ہے۔ جب تک عوام اسے ووٹ نہ دیں، وہ شرعاً حاکم نہیں بنتا۔"

اس نظریے کی بنیاد زیادہ تر "بیعت"، "شوریٰ" اور "وکالت" کے تصورات پر ہے۔ آئیے ان دلائل کا مطالعہ کریں اور نظریہ انتصاب کے حاملین کے جوابات دیکھیں۔

۱۔ بیعت کی حقیقت: انشاء یا تاکید؟

نظریۂ انتخاب والے کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور ائمہ علیہم السلام نے عوام سے بیعت لی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عوام کی رائے سے حکومت بنتی ہے۔

جواب: یہ استدلال تاریخی اور فقہی حقائق کے منافی ہے۔

- رسول اللہ ﷺ نے "بیعتِ عقبہ" میں انصار سے بیعت لی، لیکن کیا آپؐ اس بیعت سے نبی یا حاکم بنے؟ ہرگز نہیں، آپؐ تو اللہ کی طرف سے پہلے ہی حاکم تھے۔
- بیعت کا مطلب "ووٹ دینا" نہیں ہوتا، بلکہ اس کا مطلب "عہدِ وفاداری اور اطاعت" ہوتا ہے۔ بیعت کرنے والا یہ نہیں کہتا کہ "میں تمہیں حاکم بناتا ہوں"، بلکہ یہ کہتا ہے کہ "میں تسلیم کرتا ہوں کہ تم میرے حاکم ہو اور میں تمہاری اطاعت کروں گا"۔
- حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: "لِأَنَّهَا بَيْعَةٌ وَاحِدَةٌ لَا يُثَنَّى فِيهَا النَّظَرُ" "میری بیعت ایک ہی بار ہوتی ہے، اس میں نظر ثانی یا توڑنے کا اختیار نہیں ہوتا۔" اگر یہ وکالت یا عوامی معاہدہ ہوتا تو عوام کو اسے توڑنے کا حق بھی ہوتا۔

۲۔ وکالت کے نقائص: ولی "وکیل" کیوں نہیں ہو سکتا؟

اگر ہم مان لیں کہ فقیہ عوام کا "وکیل" ہے، تو فقہی طور پر نظامِ حکومت میں ایسے خلا پیدا ہو جائیں گے جن کا کوئی حل نہیں:

۱. معزولی کا حق: وکالت کے عقد میں موکل (عوام) کو حق ہوتا ہے کہ وہ جب چاہے وکیل کو معزول کر دے (بلاوجہ بھی)۔ کیا ہم یہ مان سکتے ہیں کہ عوام جب چاہیں ولی فقیہ کو ہٹا دیں،

چاہے وہ کتنا ہی عادل کیوں نہ ہو؟ یہ اسلامی نظام کے استحکام کے خلاف ہے۔

۲. دائرہ کار کی محدودیت: وکیل صرف ان کاموں میں تصرف کر سکتا ہے جن کا مالک "موکل" ہو۔ عوام اپنی جائیداد کے مالک ہیں، لیکن "حدود کا نفاذ"، "خمس و زکوٰۃ"، "جہاد کا حکم" اور "بیت المال" عوام کی ذاتی ملکیت نہیں ہیں، یہ اللہ کے احکام ہیں۔ عوام کسی کو وہ اختیار کیسے دے سکتے ہیں جو ان کے پاس خود ہی نہیں ہے؟(فاقد الشیء لا یعطیه)۔

۳. موکل کی موت: وکالت موکل کی موت سے ختم ہو جاتی ہے۔ اگر ایک نسل نے فقیہ کو وکیل بنایا، اور وہ نسل مر گئی، تو کیا فقیہ کی حکومت ختم ہو جائے گی؟

لہٰذا: ان فقہی خرابیوں سے ثابت ہوتا ہے کہ حکمرانی کا تعلق "بابِ وکالت" سے نہیں بلکہ "بابِ ولایت" سے ہے۔

امام خمینیؒ کا نظریہ: مشروعیتِ الٰہی اور مقبولیتِ عوامی کا امتزاج

عصرِ حاضر میں اسلامی جمہوریہ ایران کے بانی حضرت امام خمینیؒ نے ان مباحث کو سمیٹ کر ایک عملی اور متوازن نظریہ پیش کیا، جسے "مشروعیتِ الٰہی و مقبولیتِ مردمی" کا مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔ امامؒ کے کلام میں دونوں پہلو پوری قوت سے موجود ہیں۔

۱۔ بنیاد: ولایتِ انتصابی

امام خمینیؒ کا بنیادی عقیدہ یہی تھا کہ حکومت کا حق صرف اللہ کی طرف سے آتا ہے۔ جب انہوں نے انقلاب کے بعد مہدی بازرگان کو عبوری وزیر اعظم مقرر کیا، تو اپنے حکم نامے میں لکھا:

"بِمُوجِبِ الْوِلَايَةِ الشَّرْعِيَّةِ..." "میں اس شرعی ولایت کی بنا پر جو مجھے شارعِ مقدس (اللہ اور

رسولؐ) کی طرف سے حاصل ہے، اور اس اعتماد کی بنا پر جو عوام نے مجھ پر ظاہر کیا ہے، آپ کو حکومت تشکیل دینے کا حکم دیتا ہوں۔"

پھر فرمایا: "چونکہ میں نے اسے شرعی ولایت کی بنا پر مقرر کیا ہے، لہٰذا اس کی اطاعت واجب ہے... اس کی مخالفت اللہ کی مخالفت ہے اور اللہ کی مخالفت کفر کے مترادف ہے۔"

یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ امامؒ اپنی اتھارٹی کسی "ووٹ باکس" سے نہیں، بلکہ "نیابتِ امامِ زمانہ ارواحنا فداہ" سے اخذ کر رہے تھے۔[1]

۲۔ قِوام: عوامی رائے کا احترام (جمہوریت)

دوسری طرف، امام خمینیؒ جانتے تھے کہ اگرچہ "حق" اللہ کا ہے، لیکن "نفاذ" عوام کے بغیر ممکن نہیں اور نہ ہی اسلام جبر کو پسند کرتا ہے۔ اس لیے آپ نے فرمایا: "مِیزَان، رَأْیِ مِلَّت اَسْت" (میزان اور معیار، قوم کی رائے ہے)۔

آپ نے فرمایا: "ہمیں حق نہیں کہ ہم قوم پر اپنی مرضی مسلط کریں... جمہوریہ اسلامی کا مطلب یہ ہے کہ اس کے قوانین اسلام سے ہوں گے، لیکن اس کی تشکیل عوام کی رائے سے ہوگی۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ:

- مشروعیت: فقیہ کو اللہ نے اہل بنایا ہے۔
- فعلیت: فقیہ کو طاقت عوام دیتے ہیں۔

ایک فقیہ اس وقت تک "عملی حاکم" نہیں بن سکتا جب تک عوام اسے قبول نہ کریں۔ اگر عوام اسے مسترد

[1] خمینیؒ، صحیفہ نور، جلد ۶، صفحہ ۵۹۔

کردیں، تووہ "مشروع" توہوگا (اللہ کی نظر میں)، لیکن "مبسوط الید" (بااختیار) نہیں ہوگا، اور اسے گھر بیٹھنا پڑے گا (جیسے امیر المومنین علیہ السلام بیٹھے رہے)۔ لیکن عوام کے انکار سے اس کی شرعی اہلیت ختم نہیں ہوگی۔

۳۔ آئینی حل

ایران کے آئین نے اس بحث کو یوں سمیٹا ہے کہ خبرگان (جو عوام کے منتخب نمائندے ہیں) رہبر کو تلاش کرتے ہیں (کشف)۔ جب وہ رہبر کی بیعت کرتے ہیں، تو یہ عوام کی طرف سے "بیعت" ہوتی ہے، جس سے رہبر کو "حکم نافذ کرنے کی طاقت" ملتی ہے۔

ولایتِ مطلقہ اور ولی فقیہ کا دائرہ کار (اختیارات و وظائف)

"ولایتِ مطلقہ" کا صحیح اور غلط تصور

۱۔ ایک متنازعہ اصطلاح کی تفہیم

لفظ "مطلقہ" سنتے ہی عام ذہنوں میں "مطلق العنانیت"، آمریت اور ڈکٹیٹرشپ کا تصور ابھرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں نے ولایتِ فقیہ پر یہ اعتراض کیا کہ یہ بھی ایک طرح کی "مذہبی آمریت" ہے۔ لیکن امام خمینیؒ اور فقہائے امامیہ کے نزدیک "مطلقہ" کا مفہوم سیاسی آمریت نہیں، بلکہ ایک خالص فقہی اصطلاح ہے۔

ہم پہلے بھی مختصراً اس موضوع پر بحث کر چکے ہیں اب ہم اس اصطلاح کے دو مختلف زاویوں کا جائزہ لیں گے:

۱. غلط فہمیاں:

- کیا ولی فقیہ قانون سے بالاتر ہے؟
- کیا وہ اپنی ذاتی خواہشات کے مطابق جو چاہے کر سکتا ہے؟
- کیا وہ شریعت میں من مانی تبدیلی کر سکتا ہے؟

جواب: ہرگز نہیں۔ امام خمینیؒ فرماتے ہیں: "اگر ولی فقیہ ایک لمحے کے لیے بھی عدل سے ہٹ جائے یا کسی کو ایک تھپڑ بھی ناحق مارے، تو وہ خود بخود ولایت سے معزول ہو جاتا ہے۔"

۲. صحیح مفہوم:

"ولایتِ مطلقہ" کا اصل مطلب یہ ہے کہ: "ولی فقیہ کے حکومتی اختیارات میں کوئی فقہی رکاوٹ نہیں ہے، سوائے ان امور کے جو معصومؑ کے ساتھ خاص ہیں۔"

یعنی جس طرح رسول اللہ ﷺ اور امام علی علیہ السلام کو معاشرے کا نظم و نسق چلانے کے لیے مکمل اختیارات حاصل تھے (جیسے جنگ، صلح، ٹیکس، گورنروں کی تقرری)، اسی طرح فقیہ کو بھی یہ تمام اختیارات حاصل ہیں تاکہ وہ معاشرے کو "ڈیڈ لاک" سے بچا سکے۔

ولایتِ مطلقہ کے چار پہلو

محققین نے ولایتِ مطلقہ کے مفہوم کو مزید واضح کرنے کے لیے اس کے چار بنیادی پہلو بیان کیے ہیں:

۱۔ اطلاقِ مکانی

اسلامی حکومت کسی خاص جغرافیائی سرحد (مثلاً ایران یا عراق) تک محدود نہیں ہوتی۔ اسلام ایک آفاقی دین ہے اور اس کی ولایت بھی آفاقی ہے۔ اگرچہ عملی طور پر ولی فقیہ کا حکم وہیں چلتا ہے جہاں اس کی

حکومت قائم ہو، لیکن شرعی طور پر اس کی ولایت تمام مسلمانوں کے لیے ہے، جہاں جہاں وہ اس کی اطاعت کریں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ولایتِ فقیہ "نیشنلزم" کی حدود میں قید نہیں ہے۔

۲۔ اطلاقِ زمانی

ولایتِ فقیہ کسی خاص زمانے (مثلاً صرف جنگ کے وقت) کے لیے نہیں ہے، بلکہ یہ قیامت تک کے لیے ہے۔ جب تک انسان کو معاشرتی زندگی اور ہدایت کی ضرورت ہے، تب تک اسے ایک "سرپرست" کی ضرورت رہے گی۔ یہ ضرورت کسی دور میں ختم نہیں ہو سکتی۔

۳۔ اطلاقِ موضوعی

یہ سب سے اہم نکتہ ہے۔ ولایتِ فقیہ صرف عبادات (نماز، روزہ) تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس کا دائرہ کار سیاست، معیشت، ثقافت، دفاع، اور عدلیہ سمیت زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہے۔ کوئی بھی شعبہ ایسا نہیں ہے جسے "نوگو ایریا" (No-go Area) کہا جا سکے کہ یہاں ولی فقیہ دخل نہیں دے سکتا۔ اگر معاشرے کی مصلحت کا تقاضا ہو تو ولی فقیہ ہر شعبے میں فیصلہ کن کردار ادا کر سکتا ہے۔

۴۔ اطلاقِ حکمی

اس کا مطلب یہ ہے کہ ولی فقیہ کا حکم "نافذ العمل" ہے۔ اگر وہ کسی مسئلے میں حکم دیدے، تو تمام فقہاء، مراجع تقلید اور عوام پر اس کی اطاعت واجب ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ اگر ان کا اپنا فتویٰ اس کے خلاف بھی ہو۔[1]

---

[1] علیرضا پیروزمند، نظامِ معقول، صفحہ ۱۷۰۔

حکمِ حکومتی اور فتوائے فقہاء کا فرق

اس میں ہم "مرجع تقلید" اور "ولی فقیہ" کے کردار کا فرق سمجھیں گے۔

۱۔ فتویٰ کی ماہیت

فتویٰ ایک "ماہرانہ رائے" (Expert Opinion) ہے۔ جب کوئی شخص بیمار ہوتا ہے تو ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے، ڈاکٹر نسخہ لکھ دیتا ہے لیکن زبردستی نہیں کرتا کہ دوائی کھاؤ۔ اسی طرح مرجع تقلید لوگوں کو بتاتا ہے کہ "نماز کیسے پڑھنی ہے"، "روزہ کیسے رکھنا ہے"۔ یہ ایک انفرادی عمل ہے۔ لوگ آزاد ہیں کہ وہ جس مرجع کو چاہیں فالو کریں۔ ایک شہر میں دس مراجع ہو سکتے ہیں اور ہر ایک کے مقلدین الگ الگ عمل کر سکتے ہیں۔

۲۔ حکم کی ماہیت

حکم ایک "الزامی فرمان" ہے۔ معاشرتی اور سیاسی معاملات میں یہ ممکن نہیں کہ ہر شخص الگ الگ مرجع کی بات مانے۔ مثلاً ٹریفک کے قوانین، جنگ کا اعلان، یا عید کا چاند۔ ان معاملات میں "وحدتِ قیادت" ضروری ہے۔ یہاں ولی فقیہ کا کام شروع ہوتا ہے۔

- مثال: اگر ولی فقیہ حکم دے کہ "آج عید ہے"، یا "تمباکو حرام ہے" (جیسے مرزا شیرازی کا حکم)، تو یہ فتویٰ نہیں بلکہ "حکمِ حکومتی" ہے۔ اس صورت میں تمام مراجع تقلید اور ان کے مقلدین پر واجب ہے کہ وہ اپنے فتوے کو چھوڑ کر ولی فقیہ کے حکم کی پیروی کریں، ورنہ نظام درہم برہم ہو جائے گا۔
- اصول: "نقضِ حکم حرام ہے۔" یعنی جب حاکمِ شرع حکم دے دے تو کوئی دوسرا مجتہد اسے نہیں توڑ سکتا۔

تزاحم کا حل اور مصلحتِ نظام

ولایتِ مطلقہ کا ایک اور اہم ترین اختیار "تزاحم" کو حل کرنا ہے۔

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ شریعت کا ایک حکم (مثلاً حج پر جانا) ملکی مصلحت یا نظام کی بقا کے خلاف ہو جاتا ہے (مثلاً اگر حج پر جانے سے دشمن کو فائدہ پہنچ رہا ہو یا وبا پھیلنے کا خطرہ ہو)۔

ایسی صورت میں ولی فقیہ اپنے "مطلق اختیارات" کو استعمال کرتے ہوئے:

۱. احکامِ اولیہ کو عارضی طور پر معطل کر سکتا ہے۔

۲. احکامِ ثانویہ کو نافذ کر سکتا ہے۔

امام خمینیؒ نے فرمایا: "حکومت اسلامی احکامِ اولیہ میں سے ہے اور تمام فرعی احکام (جیسے نماز، روزہ، حج) پر مقدم ہے۔ اگر حج بھی نظامِ اسلام کے لیے نقصان دہ ہو جائے تو ولی فقیہ اسے عارضی طور پر روک سکتا ہے۔"

یہ اختیار اس لیے دیا گیا ہے تاکہ اسلام کا نظام کسی بھی دور میں "بند گلی" میں نہ پھنسے۔ مصلحتِ نظام کی تشخیص کے لیے ایران میں "مجمعِ تشخیصِ مصلحتِ نظام" کا ادارہ قائم کیا گیا ہے۔[1]

ولایتِ فقیہ کا بین الاقوامی دائرۂ کار اور سرحدیں

نیشن اسٹیٹ بمقابلہ امتِ واحدہ

عصرِ حاضر کی سیاست میں "ریاست" کا تصور "قومیت" اور "جغرافیائی سرحدوں" میں قید ہے۔ یعنی ایک

[1] سورہ انبیاء آیت ۹۲۔

ملک کا قانون دوسرے ملک میں نہیں چل سکتا۔ لیکن اسلام کا سیاسی تصور اس سے بالکل مختلف ہے۔

اسلام میں "قومیت" کی بنیاد نسل، زبان یا وطن نہیں، بلکہ "عقیدہ" ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے: ﴿إِنَّ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً﴾ "بیشک یہ تمہاری امت ایک ہی امت ہے۔"[1]

چونکہ اسلام ایک آفاقی دین ہے، لہٰذا اس کی حکومت بھی اصولی طور پر "عالمی" ہوتی ہے۔ امام مہدی ارواحنا فداہ کی حکومت پوری دنیا پر ہوگی۔ زمانہ غیبت میں ولی فقیہ، جو امام کا نائب ہے، اس کی ولایت کا دائرہ کار بھی شرعی طور پر پوری امتِ مسلمہ پر محیط ہے، اگرچہ عملی طور پر وہ کسی خاص خطے میں محدود ہو سکتا ہے۔

ولی فقیہ کا حکم اور جغرافیائی سرحدیں

محققین نے اس نازک موضوع پر انتہائی دقیق بحث کی ہے اور چار مختلف صورتوں کا جائزہ لیا ہے:

صورت اول: غیر مسلم ممالک میں رہنے والے مسلمان

اگر کوئی مسلمان امریکہ، یورپ یا کسی بھی غیر اسلامی ملک میں رہتا ہے، تو کیا اس پر ولی فقیہ کا حکم ماننا واجب ہے؟

- جواب: چونکہ ولی فقیہ کی ولایت "الٰہی" ہے، لہٰذا اس کا حکم ہر مسلمان پر واجب ہے، چاہے وہ دنیا کے کسی بھی کونے میں ہو۔ مثلاً اگر ولی فقیہ حکم دے کہ "آج عید ہے" یا "سلمان رشدی واجب القتل ہے"، تو یہ حکم لندن اور نیویارک میں بیٹھے مسلمان پر بھی اسی طرح لاگو ہوگا جیسے کربلا و نجف، تہران و قم میں بیٹھے مسلمان پر۔ کیونکہ "شرعی احکام" سرحدوں کے پابند نہیں ہوتے۔

---

[1] جوادی آملی، ولایت فقیہ، صفحہ ۱۶۹۔

صورت دوم: ایک سے زائد اسلامی حکومتیں

اگر دنیا میں دو اسلامی حکومتیں ہوں (مثلاً ایران اور کوئی اور ملک)، اور دونوں میں ولی فقیہ موجود ہوں، تو کس کی اطاعت واجب ہوگی؟

- جواب: اگر دونوں فقیہ شرعی طور پر حاکم ہیں اور اپنے اپنے دائرے میں کام کر رہے ہیں، تو ہر ملک کے عوام اپنے حاکم کی اطاعت کریں گے۔ لیکن اگر ان میں سے ایک فقیہ "اعلم اور افضل" ہو اور اس کا حکم "امتِ مسلمہ کے عمومی مصالح" (جیسے اسرائیل کے خلاف جہاد) کے بارے میں ہو، تو دوسرے فقیہ اور اس کے عوام پر بھی واجب ہے کہ وہ اس حکم کی تائید کریں، تاکہ امت میں انتشار نہ ہو۔

صورت سوم: حکم کا ٹکراؤ

اگر ولی فقیہ کا حکم کسی دوسرے ملک کے قانون سے ٹکرا جائے تو کیا ہوگا؟

- جواب: اگر معاملہ "حرام و حلال" کا ہے (جیسے حجاب پر پابندی)، تو مسلمان پر ولی فقیہ (حکمِ الٰہی) کی اطاعت واجب ہے، چاہے اسے اس ملک کا قانون توڑنا پڑے۔ لیکن اگر معاملہ انتظامی نوعیت کا ہے (جیسے ٹریفک قوانین)، تو وہاں کے قانون کی پاسداری کی جا سکتی ہے تاکہ ہرج و مرج نہ ہو۔

عملی تطبیق

تاریخی طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ علماء کے فتاویٰ سرحدوں کو عبور کرتے رہے ہیں۔

- تمباکو تحریک: مرزا شیرازی سامراء (عراق) میں بیٹھے تھے، لیکن ان کے حکم پر ایران میں تمباکو بائیکاٹ ہوا اور بادشاہ کو جھکنا پڑا۔

- فتویٰ رشدی: امام خمینیؒ نے ایران سے حکم دیا، لیکن پوری دنیا کے مسلمانوں نے اسے اپنا دینی فریضہ سمجھا۔
- فلسطین و لبنان: آج بھی ولی فقیہ کی حمایت اور حکم کی وجہ سے لبنان اور فلسطین کے مجاہدین (جو ایران کے شہری نہیں ہیں) اسرائیل کے خلاف مزاحمت کر رہے ہیں۔

یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ولایتِ فقیہ کی طاقت "جغرافیہ" میں نہیں، بلکہ "ایمان" میں پنہاں ہے۔[1]

"ام القریٰ" کا نظریہ

بعض مفکرین (جیسے محمد جواد لاریجانی) نے "ام القریٰ" کا نظریہ پیش کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس ملک میں اسلامی حکومت قائم ہو جائے (جیسے ایران)، وہ پوری دنیا کے مسلمانوں کے لیے "مرکز" کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

- اس ملک کی حفاظت صرف اس ملک کے شہریوں کا فرض نہیں، بلکہ پوری امت کا فرض ہے، کیونکہ یہ "اسلام کا قلعہ" ہے۔
- اس کے حکمران (ولی فقیہ) کی ذمہ داری بھی صرف اپنے شہریوں تک محدود نہیں، بلکہ پوری دنیا کے مظلوم مسلمانوں کی حمایت ان پر واجب ہے۔

لہٰذا، ولایتِ فقیہ کا نظام "نیشنلزم" (قوم پرستی) کو رد کرتا ہے اور "انٹرنیشنلزم" (بین الاقوامیت) پر یقین رکھتا ہے۔

---

[1] مصباح، اختیارات ولی فقیہ در خارج از مرزہا، صفحہ ۸۱ تا ۹۵۔

باب ششم: اسلامی نظام میں انتخابِ رہبر اور اہلِ حل و عقد (خبرگان)

مجلسِ خبرگان کی ضرورت اور فلسفہ

ولایت اور مرجعیت کا فرق

اسلامی نظام میں "رہبری" (ولایت) اور "مرجعیت" (تقلید) دو الگ الگ منصب ہیں۔ مرجعیت میں "تعدد" ممکن ہے؛ ایک ہی وقت میں کئی مراجع ہو سکتے ہیں اور لوگ جس کی چاہیں تقلید کریں۔ لیکن "ولایت" میں وحدت ضروری ہے۔ ایک ملک کا ایک ہی حکمران ہو سکتا ہے، ورنہ نظام بکھر جائے گا۔

چونکہ رہبر کا انتخاب پوری قوم کے نظم و نسق کا معاملہ ہے، اس لیے اسے عام انتخابات کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ عوام کی اکثریت فقیہ کی علمی گہرائی، اجتہاد اور سیاسی بصیرت کو پرکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اس لیے اسلام نے "رجوع الی الخُبرہ" (ماہرین کی طرف رجوع) کا اصول اپنایا ہے۔

مجلسِ خبرگان کا کردار

مجلسِ خبرگان (Assembly of Experts) دراصل قوم کے منتخب فقہاء اور مجتہدین کا ایک بورڈ ہے جن کا کام دو چیزیں ہیں:

1. کشفِ رہبر: وہ تلاش کرتے ہیں کہ اس وقت موجود فقہاء میں سے کون سا فقیہ "علم، عدالت اور تدبیر" میں سب سے برتر (اصلح) ہے۔
2. نظارت: وہ مسلسل نگرانی رکھتے ہیں کہ کیا رہبر میں وہ شرائط (جو شروع میں تھیں) اب بھی باقی

ہیں یا نہیں؟ اگر رہبر کسی شرط سے محروم ہو جائے (مثلاً پاگل ہو جائے یا گناہ کرے)، تو خبرگان اسے معزول کرنے کا اعلان کرتے ہیں۔

یہ طریقہ "جمہوریت" اور "اہلیت" کا بہترین امتزاج ہے۔ عوام براہِ راست رہبر کو نہیں چنتے (کیونکہ وہ اہلیت نہیں پرکھ سکتے)، بلکہ وہ ان ماہرین کو چنتے ہیں جو رہبر کو پہچان سکیں۔[1]

تعیینِ رہبر کا طریقہ کار (آئینی اور فقہی پہلو)

۱۔ آئینی ارتقاء

ایران کے پہلے آئین (۱۹۷۹ء) میں رہبر کے انتخاب کے دو راستے تھے: یا تو عوام کی اکثریت کسی کو بلاواسطہ قبول کرلے (جیسے امام خمینیؒ کو کیا)، یا پھر خبرگان منتخب کریں۔

لیکن ۱۹۸۹ء کی ترمیم کے بعد اب صرف ایک ہی راستہ ہے: "مجلسِ خبرگان کے ذریعے انتخاب"۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امام خمینیؒ جیسی شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہے جسے پوری قوم یکجا ہو کر مان لے۔ عام حالات میں اختلاف ہوتا ہے، اس لیے ماہرین کا فیصلہ ہی حتمی ہوتا ہے۔

۲۔ انتخاب یا انتصاب؟

یہاں پھر وہی بحث آتی ہے کہ کیا خبرگان رہبر کو "نصب" کرتے ہیں یا "کشف"؟

- آیت اللہ مصباحؒ اور جوادی آملی کا موقف: خبرگان کا کام "انشاء" (بنانا) نہیں، بلکہ "کشف" (پہچاننا) ہے۔ یعنی اللہ نے جس فقیہ کو صلاحیت دی ہے، خبرگان گواہی دیتے ہیں کہ "یہ ہے وہ شخص"۔

---

[1] غازی، آشنایی با مجلس خبرگان پرسشہا و پاسخہا، جلد ۱ صفحہ ۱۷۔

- آیت اللہ منتظری کا موقف: خبرگان عوام کے وکیل ہیں اور وہ عوام کی طرف سے فقیہ کو حکمرانی کا "عقد" (Contract) دیتے ہیں۔

آئینِ جمہوریہ اسلامی میں "ولایتِ مطلقہ" کا لفظ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نظام کا جھکاؤ "نظریہ انتصاب/کشف" کی طرف زیادہ ہے، لیکن عملی طریقہ کار "انتخابی" ہے۔

شبہۂ دَور اور اس کا جواب

یہ بحث اکثر مخالفین اور جدید تعلیم یافتہ طبقے کی طرف سے اٹھائی جاتی ہے۔

۱۔ اشکال کی صورت

اعتراض یہ ہے کہ نظامِ ولایتِ فقیہ میں ایک منطقی خرابی پائی جاتی ہے:

۱. ولی فقیہ --> شورائے نگہبان کے ممبران کو منتخب کرتا ہے۔

۲. شورائے نگہبان --> مجلسِ خبرگان کے امیدواروں کی اہلیت کی تصدیق کرتی ہے۔

۳. مجلسِ خبرگان --> ولی فقیہ کو منتخب (یا معزول) کرتی ہے۔

نتیجہ: گویا ولی فقیہ خود اپنے چننے والوں کو چن رہا ہے۔ یہ "دور" ہے، اور منطق میں دور باطل ہے۔

۲۔ آیت اللہ مصباح یزدی کا جواب

اس اشکال کے تین بنیادی اور ٹھوس جوابات دیے گئے ہیں:

جواب اول: منبعِ مشروعیت کا فرق

یہ اشکال تب پیدا ہوتا اگر ولی فقیہ کی مشروعیت کا دارومدار "خبرگان" پر ہوتا۔ لیکن جیسا کہ ہم ثابت

کر چکے ہیں، ولی فقیہ کی مشروعیت "اللہ" کی طرف سے ہے (نصبِ الٰہی)۔ خبرگان کا کام اسے "مشروعیت دینا" نہیں، بلکہ صرف "پہچاننا" (کشف) ہے۔

لہٰذا سلسلہ یوں ہے: اللہ -> ولی فقیہ -> شورای نگہبان -> خبرگان -> (کشفِ) ولی فقیہ۔

یہاں دائرہ نہیں بنتا، کیونکہ مشروعیت کا آغاز اللہ سے ہو رہا ہے، خبرگان سے نہیں۔

جواب دوم: شمع اور ماچس کی مثال

فرض کریں ایک شمع (ولی فقیہ اول: امام خمینیؒ) روشن ہے۔ اس سے ہم نے ایک ماچس (شورائے نگہبان/خبرگان) جلائی۔ اب اگر وہ پہلی شمع بجھ جائے، اور ہم اسی ماچس سے دوسری شمع (ولی فقیہ دوم: آیت اللہ سید علی خامنہ ایؒ، ولی فقیہ سوم: سید مجتبیٰ خامنہ ای دام ظلّہ [1]) کو روشن کریں، تو یہ دَور نہیں ہے۔ کیونکہ دوسری شمع کو روشن کرنے والی ماچس نے اپنی آگ پہلی شمع سے لی تھی، نہ کہ دوسری شمع سے۔

اسی طرح:

- امام خمینیؒ (رہبر اول) نے شورائے نگہبان بنائی۔
- شورائے نگہبان نے خبرگان بنائے۔
- خبرگان نے آیت اللہ خامنہ ایؒ (رہبر دوم) > (ولی فقیہ سوم: سید مجتبیٰ خامنہ ای دام ظلّہ) کو چنا۔

یہاں کوئی دَور نہیں ہے، کیونکہ رہبرِ دوم و سوّم نے خبرگان کو نہیں بنایا، بلکہ رہبرِ اول کے بنائے ہوئے سسٹم نے خبرگان کو بنایا۔

---

[1] آج ۲۹ رمضان ۱۴۴۷ مطابق ۱۹ مارچ ۲۰۲۶ رات ۳:۳۳ پر جب یہ سطور لکھ رہا ہوں تو یہاں ایران میں جنگ کے حالات ہیں۔

جواب سوم: جمہوریت کا مشترکہ مسئلہ

اگر ہم اس اشکال کو مان لیں، تو دنیا کا کوئی بھی جمہوری نظام نہیں بچتا۔

- جمہوریت میں "عوام" ووٹ دے کر "پارلیمنٹ" بناتے ہیں۔
- پارلیمنٹ "قانون" بناتی ہے کہ "الیکشن کیسے ہوگا؟"
- پھر اسی قانون کے تحت دوبارہ "عوام" ووٹ دیتے ہیں۔

اگر یہ دَور ہے تو جمہوریت بھی باطل ہے۔ لیکن سب مانتے ہیں کہ پہلا قانون (آئین) ایک "موسس مجلس" بناتی ہے جو اس چکر سے باہر ہوتی ہے۔ اسی طرح اسلامی نظام میں "بانیِ انقلاب" (امام خمینیؒ) اس چکر سے باہر ہیں، انہوں نے سسٹم بنا دیا، اب وہ چل رہا ہے۔

رہبر کی معزولی کا نظام

اسلامی نظام میں رہبر "تاحیات" ہو سکتا ہے، لیکن "غیر مشروط" نہیں۔ اگر خبرگان کو پتہ چلے کہ رہبر میں "عدالت" یا "تدبیر" کی کمی آ گئی ہے، تو وہ اسے فوری معزول کر دیتے ہیں۔

یہ عمل کسی "فوجی بغاوت" یا "خونی انقلاب" کے ذریعے نہیں، بلکہ ایک "آئینی ادارے" (خبرگان) کے ذریعے انجام پاتا ہے، جو اس نظام کی پختگی کی دلیل ہے۔

عوامی جمہوریت اور ولایتِ فقیہ

اسلام اور جمہوریت کا امتزاج

عصرِ حاضر میں دو بڑے سیاسی نظریات مدمقابل ہیں: ایک "لبرل ڈیموکریسی" (مغربی جمہوریت) اور

دوسرا "تھیوکریسی" (مذہبی آمریت)۔ اسلامی جمہوریہ ایران نے ان دونوں کے درمیان ایک نیا راستہ متعارف کروایا ہے جسے "دینی جمہوریت" یا "مذہبی بنیادوں پر قائم جمہوری نظام" اور جسے "دین پر مبنی جمہوری طرزِ حکمرانی" کہا جاتا ہے۔

اس اصطلاح کے دو اجزاء ہیں:

۱. عوام نوازی: یعنی حکومت کی تشکیل، بقاء اور انتظام میں عوام کا کلیدی کردار۔ عوام فیصلہ ساز ہیں۔

۲. دینی: یعنی یہ جمہوریت "مطلق العنان" نہیں ہے، بلکہ یہ "الٰہی اقدار اور قوانین" کی پابند ہے۔

امام خمینیؒ نے فرمایا: "جمہوریہ اسلامی؛ نہ ایک لفظ کم، نہ ایک لفظ زیادہ۔" اس کا مطلب یہ تھا کہ جمہوریت (عوام) اور اسلام (قانون) ایک سکے کے دو رخ ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ تکمیل کرنے والے ہیں۔

مغربی جمہوریت سے فرق

مغربی جمہوریت کی بنیاد "ہیومنزم" (انسان پرستی) پر ہے، جہاں انسان خود قانون بناتا ہے اور خود ہی حاکمیتِ اعلیٰ کا مالک ہے۔ وہاں ۵۱ فیصد اکثریت ۴۹ فیصد پر ہر قسم کا قانون (چاہے وہ ہم جنس پرستی جیسا غیر اخلاقی قانون ہو) مسلط کر سکتی ہے۔

اسلامی جمہوریت کی بنیاد "توحید" پر ہے۔ یہاں انسان قانون ساز نہیں، بلکہ "مجریٔ قانون" ہے۔ عوام کی رائے کا احترام کیا جاتا ہے، لیکن اس دائرے میں رہ کر جو اللہ نے مقرر کیا ہے۔ اگر عوام کوئی ایسا فیصلہ کریں جو شریعت سے ٹکرائے، تو وہ فیصلہ باطل ہوگا، کیونکہ مسلمان ہونے کے ناطے عوام نے پہلے ہی اللہ کی حاکمیت کو قبول کر لیا ہے۔

نظامِ ولایتِ فقیہ میں عوام کا مقام

بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ "ولایتِ فقیہ میں عوام بھیڑ بکریاں ہیں اور فقیہ چرواہا ہے"۔ یہ تصور غلط ہے۔ اسلامی نظام میں عوام کا کردار انتہائی فعال اور فیصلہ کن ہوتا ہے، جسے امام خمینیؒ کے اقوال کی روشنی میں یوں سمجھا جاسکتا ہے:

۱۔ حکومت کی تشکیل میں کردار

اگرچہ ولایت کا "حق" اللہ کی طرف سے آتا ہے، لیکن حکومت کی "تشکیل" عوام کے بغیر ناممکن ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: "اگر لوگ میرے پاس بیعت کے لیے نہ آتے... تو میں خلافت کی رسی اس کے کندھے پر ڈال دیتا۔"

امام خمینیؒ نے فرمایا: "مَا تَابِعِ آرَاءِ مِلَّت هستِیم" (ہم قوم کی رائے کے تابع ہیں)۔

"اگر عوام کسی فقیہ کو قبول نہ کرے، تو وہ فقیہ زبردستی حکومت نہیں کر سکتا۔ اس کی ولایت تبھی نافذ العمل ہوگی جب عوام اس کی بیعت کریں یا اس کے منتخب کردہ خبرگان اسے چن لیں۔"[1]

۲۔ نظارت اور تنقید کا حق

اسلامی نظام میں عوام صرف "ووٹ دینے والی مشین" نہیں، بلکہ وہ "نظارت" (نگرانی) کا حق رکھتے ہیں۔

امام خمینیؒ نے فرمایا: "ہر فرد، چاہے وہ ادنیٰ ترین شہری ہو، اسے حق ہے کہ وہ رہبرِ اعلیٰ کو تنقید کا نشانہ بنائے اور اگر رہبر کے پاس جواب نہ ہو، تو وہ معزول ہو جائے گا۔"

---

[1] خمینی، صحیفہ امام، جلد ۵، صفحہ ۳۱۔

یہ "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کا فریضہ ہے جو ہر مسلمان پر واجب ہے۔ اگر ولی فقیہ یا اس کے کارندے غلطی کریں، تو عوام کا فرض ہے کہ وہ بولیں اور اصلاح کریں۔ اسلامی معاشرہ ایک "زندہ اور بیدار" معاشرہ ہوتا ہے، مردہ نہیں۔

۳۔ انتخابات میں شرکت

رہبر سے لے کر صدر، پارلیمنٹ اور مجالسِ شوریٰ تک، تمام ادارے عوام کے ووٹوں سے بنتے ہیں۔ امام خمینیؒ نے اپنی وصیت میں فرمایا: "وصیت کرتا ہوں کہ تمام انتخابات میں... بھرپور شرکت کریں، کیونکہ اگر آپ نے غفلت کی اور نااہل لوگ آ گئے، تو اسلام اور ملک کو جو نقصان ہوگا اس کے ذمہ دار آپ ہوں گے۔"

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عوام نظام کے "تماشائی" نہیں بلکہ "محافظ" ہیں۔

ولی فقیہ اور عوام کا باہمی رشتہ

اسلامی نظام میں حکمران اور عوام کا رشتہ "حاکم و محکوم" کا نہیں، بلکہ "امام و ماموم" اور "عاشق و معشوق" کا ہوتا ہے۔

۱۔ تاریخی تناظر: اطاعت بمقابلہ محبت

آیت اللہ جوادی آملی نے اس موضوع پر خوبصورت بحث کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ولایت کی بنیاد "خشک قانون" پر نہیں بلکہ "ایمان اور محبت" پر ہوتی ہے۔

- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دور: احد کی جنگ میں جب افواہ اڑی کہ نبیؐ شہید ہو گئے، تو مدینہ کی خواتین اپنے شہید شوہروں اور بیٹوں کو چھوڑ کر نبیؐ کی خیریت پوچھ رہی تھیں۔ یہ وہ "محبت کا رشتہ" تھا جس نے ریاستِ مدینہ کو ناقابلِ شکست بنایا۔

- امام خمینیؒ کا دور: جب امامؒ نے حکم دیا کہ "شاہ کو بھگاؤ"، تو لوگ ٹینکوں کے سامنے لیٹ گئے۔ یہ طاقت بندوق کی نہیں تھی، بلکہ "دلی وابستگی" کی تھی۔ ولی فقیہ عوام کے دلوں پر حکومت کرتا ہے، صرف جسموں پر نہیں۔

۲۔ ولایت اور عوامی طاقت

تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی علماء اور عوام کا رشتہ مضبوط ہوا، استعمار کو شکست ہوئی۔

- تنباکو تحریک: جب مرزا شیرازی نے فتویٰ دیا کہ "تنباکو پینا حرام ہے"، تو شاہ کے محل میں بھی حقے ٹوٹ گئے۔ یہ "عوامی طاقت" تھی جو ولایت کے سائے میں بیدار ہوئی۔
- عراق کی آزادی: آیت اللہ محمد تقی شیرازیؒ کے فتوے پر عوام نے انگریزوں کو نکال باہر کیا۔

لہٰذا، ولایتِ فقیہ عوام کو کمزور نہیں کرتی، بلکہ انہیں "متحد اور طاقتور" بناتی ہے۔

کیا ولایتِ مطلقہ جمہوریت کی ضد ہے؟

یہ سب سے اہم سوال ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر ولی فقیہ کے پاس "مطلق اختیار" ہے تو پھر عوام کا کیا کام؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ولی فقیہ کا "مطلق اختیار" دراصل "عوام کے مفادات کے تحفظ" کے لیے ہے۔

۱. تعطل کا خاتمہ: اگر پارلیمنٹ اور حکومت کسی مسئلے میں پھنس جائیں، تو ولی فقیہ اپنے اختیار سے گتھی سلجھاتا ہے اور سیاسی تعطل کا ازالہ کرتا ہے۔

۲. آئین کا محافظ: ولی فقیہ اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ منتخب حکومت عوام کے حقوق غصب نہ کرے اور اسلام سے انحراف نہ کرے۔ وہ جمہوریت کا دشمن نہیں، بلکہ "جمہوریت کا نگہبان" ہے۔

۳۔ قانونی جواز: جیسا کہ گزرا، چونکہ اصل حاکمیت اللہ کی ہے، اس لیے صدر یا پارلیمنٹ کے فیصلوں کو "شرعی جواز" ولی فقیہ کی توثیق (تنفیذ) سے ملتا ہے۔ اس کے بغیر وہ "طاغوت" ہیں۔

کارکردگی اور مشروعیت کا باہمی تعلق

ا۔ کارکردگی کیا ہے؟

جدید سیاسیات میں یہ سوال شدت سے اٹھایا جاتا ہے کہ اگر ایک حکومت "مشروع" (شرعی/آئینی) تو ہو، لیکن وہ عوام کے مسائل حل کرنے میں "ناکام" ہو، تو کیا اس کی مشروعیت برقرار رہتی ہے؟

"کارکردگی" کا مطلب ہے حکومت کا وہ "فنکشنل" (Functional) پہلو جس کے ذریعے وہ اپنے مقاصد (امن، انصاف، رفاہ) حاصل کرتی ہے۔ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی سیرت اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کا مقصد صرف "کرسی پر بیٹھنا" نہیں، بلکہ "عدل کا قیام اور ظلم کا خاتمہ" ہے۔ اگر حکومت یہ نہ کر سکے، تو وہ اپنے "فلسفہ وجودی" سے محروم ہو جاتی ہے۔

۲۔ مشروعیت اور کارکردگی کا ربط

شہید مرتضیٰ مطہریؒ فرماتے ہیں کہ اسلام کے اصول "ثابت" ہیں، لیکن ان کا اطلاق "متغیّر" ہے۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ ہر دور کے تقاضوں کے مطابق اپنی "کارکردگی" دکھائے۔

- دوجہتی تعلق: مشروعیت اور کارکردگی کا تعلق "لازم و ملزوم" کا ہے۔
  - مشروعیت: حکومت کو "حق" دیتی ہے۔
  - کارکردگی: حکومت کو "بقاء" دیتی ہے۔

اگر حکومت کارآمد نہ ہو، تو عوام کا اعتماد اٹھ جاتا ہے، اور جب عوامی حمایت ختم ہو جائے، تو اسلامی

حکومت "عملاً" ختم ہو جاتی ہے (چاہے وہ شرعاً حق پر ہو)۔ امام علی علیہ السلام کا فرمان ہے: "اگر لوگ میرے پاس نہ آتے... تو میں خلافت کی رسی چھوڑ دیتا۔" یہ "کارکردگی" کی شرط تھی (یعنی عوام کی مدد کے بغیر حکومت نہیں چل سکتی)۔

۳۔ "حفظِ نظام" کا فریضہ

امام خمینیؒ نے فرمایا: "حِفْظِ نِظَام اَز اَوْجَبِ وَاجِبَات اَسْت" (نظام کا تحفظ تمام واجبات میں سب سے بڑا واجب ہے)۔

- نظام کو بچانا نماز روزے سے بھی زیادہ اہم ہے، کیونکہ اگر نظام ٹوٹ گیا تو اسلام کو خطرہ ہوگا۔ اور نظام تب ہی بچ سکتا ہے جب وہ "کارآمد" ہو۔ اگر حکومت عوام کو روٹی، کپڑا، مکان اور انصاف نہ دے سکے، تو نظام خطرے میں پڑ جائے گا، اور "ناکارکردگی" کی وجہ سے نظام کا گرنا "حرام" ہے۔
- پس ثابت ہوا کہ ولی فقیہ اور اسلامی حکومت پر شرعاً واجب ہے کہ وہ اپنی کارکردگی کو بہتر بنائیں، ورنہ وہ "گناہگار" ہوں گے کیونکہ انہوں نے نظام کو کمزور کیا۔

۴۔ مقبولیت اور کارکردگی

اسلامی نظام میں مقبولیت صرف "ووٹ" کا نام نہیں، بلکہ یہ "کارکردگی" کا نتیجہ ہے۔ جب حکومت عدل کرتی ہے تو مقبولیت بڑھتی ہے، اور جب مقبولیت بڑھتی ہے تو حکومت کے ہاتھ (اقتدار) مضبوط ہوتے ہیں۔

- نتیجتاً: ایک ولی فقیہ اگرچہ اللہ کی طرف سے "منصوب" ہے، لیکن اگر وہ یا اس کا سسٹم ناکارہ ہو جائے، تو وہ اپنا "بسطِ ید" کھو بیٹھتا ہے۔ اس لیے "کارکردگی" صرف سیاسی ضرورت نہیں، بلکہ

"دینی فریضہ" ہے۔

بابِ ہفتم: ولایتِ فقیہ، آزادی اور انسانی حقوق

اسلام میں فکر و عقیدہ کی آزادی کا تصور

۱۔ فکر اور عقیدہ میں فرق

شہید مرتضیٰ مطہریؒ نے اس موضوع پر بحث کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اسلام میں "فکر" اور "عقیدہ" دو الگ الگ چیزیں ہیں۔

- آزادئ تفکر: اسلام نہ صرف "تفکر" (سوچنے) کی آزادی دیتا ہے بلکہ اسے "عبادت" قرار دیتا ہے۔ قرآن بار بار کہتا ہے: "أَفَلَا يَتَفَكَّرُونَ"۔ اصولِ دین (توحید، نبوت وغیرہ) میں تقلید جائز نہیں، ہر انسان کو "آزادانہ غور و فکر" کے ذریعے ان حقائق تک پہنچنا چاہیے۔ شک کرنا بھی بُرا نہیں اگر وہ تحقیق کا پہلا زینہ ہو۔

- آزادئ عقیدہ: لیکن "عقیدہ" کا معاملہ الگ ہے۔ اگر عقیدہ "تفکر" کا نتیجہ ہو تو اسلام اس کا احترام کرتا ہے۔ لیکن اگر عقیدہ "جہالت، تقلید اور تعصب" کی پیداوار ہو (جیسے بت پرستی، گائے کی پوجا)، تو اسلام اسے "آزادی" نہیں بلکہ "ذہنی غلامی" سمجھتا ہے۔

شہید مطہریؒ کہتے ہیں: "انبیاء اس لیے آئے تھے کہ وہ انسانوں کو ان خرافات کی زنجیروں سے آزاد کریں، نہ کہ انہیں اس جہالت پر باقی رہنے کی آزادی دیں۔"

۲۔ ارتداد اور آزادی

یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ اگر اسلام آزادی دیتا ہے تو مرتد کی سزا قتل کیوں ہے؟

جواب یہ ہے کہ اسلام میں "ذاتی شک" پر کوئی سزا نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص تحقیق کرتے ہوئے اسلام سے پھر جائے اور اسے اپنے دل میں رکھے، تو ریاست اس کے پیچھے نہیں پڑتی۔ سزا تب ہے جب وہ اس ارتداد کا "اعلان" کرے اور معاشرے کے عقائد پر حملہ آور ہو۔ یہ "فکری آزادی" کا مسئلہ نہیں، بلکہ "نظمِ عمومی" (Public Order) اور "سیاسی بغاوت" کا مسئلہ ہے۔

انسانی حقوق اور آزادی کی حدود

آیت اللہ مصباح یزدیؒ نے اس موضوع پر مغربی اور اسلامی نظریات کا تقابل پیش کیا ہے۔

ا۔ مغربی نقطہ نظر: "دوسروں کی آزادی"

مغرب میں آزادی کی واحد حد یہ ہے کہ "دوسرے کی آزادی متاثر نہ ہو"۔ یعنی آپ جو چاہیں کریں، بس دوسرے کو نقصان نہ پہنچائیں۔ اس اصول کے تحت وہاں خودکشی، ہم جنس پرستی اور توہینِ مذہب جائز سمجھی جاتی ہے کیونکہ بظاہر اس سے کسی دوسرے کی "مادی آزادی" سلب نہیں ہوتی۔

۲۔ اسلامی نقطۂ نظر: "مصالحِ مادی و معنوی"

اسلام کہتا ہے کہ انسان صرف حیوان نہیں کہ اسے صرف مادی نقصان سے بچایا جائے۔ انسان ایک روحانی وجود ہے۔ لہٰذا، آزادی کی حد صرف "دوسروں کی آزادی" نہیں، بلکہ "معاشرے کے مادی اور معنوی مصالح" بھی ہیں۔

- اگر کوئی عمل (جیسے نشہ، بے حیائی، توہینِ رسالت) معاشرے کی اخلاقی اور روحانی صحت کو برباد

کرے، تو وہ "آزادی" نہیں بلکہ "زہر" ہے۔ ریاست کا فرض ہے کہ وہ اس زہر کو روکے۔ جس طرح ریاست عوام کو "گندا پانی" پینے کی آزادی نہیں دیتی، اسی طرح "گندے افکار" پھیلانے کی آزادی بھی نہیں دے سکتی۔

ولایتِ فقیہ اور آزادی کا ربط

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ولایتِ فقیہ میں "آمریت" ہے اور آزادی ختم ہو جاتی ہے۔ اس غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔

۱۔ آزادی: الوہی بمقابلہ مادی

اسلام میں حقیقی آزادی یہ ہے کہ انسان "ہوائے نفس" (خواہشات) کی غلامی سے نکل کر "اللہ" کی بندگی میں آجائے۔ ولایتِ فقیہ انسان کو طاغوتوں (سرمایہ داروں، بادشاہوں، ڈکٹیٹروں) کی غلامی سے نکال کر قانونِ الٰہی کے تابع کرتی ہے۔ یہ "سلبِ آزادی" نہیں، بلکہ "عینِ آزادی" ہے۔

۲۔ نظامِ ولایت میں سیاسی آزادی

نظامِ ولایتِ فقیہ میں عوام کو تین سطحوں پر آزادی حاصل ہے:

۱. انتخاب: عوام اپنی مرضی سے خبرگان، صدر اور پارلیمنٹ منتخب کرتے ہیں۔

۲. تنقید: عوام کو حکمرانوں پر تنقید اور احتساب کا حق حاصل ہے۔

۳. مشارکت: عوام سیاسی عمل میں شریک ہوتے ہیں۔

لیکن یہ سب آزادیاں "قانونِ الٰہی" کے دائرے میں ہیں۔ اگر کوئی آزادی ایسی ہو جو انسان کو اللہ سے دور کر دے (جیسے فحاشی کی آزادی)، تو ولایتِ فقیہ اس کی اجازت نہیں دیتی۔

عالمی انسانی حقوق کا منشور اور اسلام

اقوامِ متحدہ کا انسانی حقوق کا چارٹر (UDHR) مغربی اقدار پر مبنی ہے۔ اس میں بعض دفعات اسلام سے ٹکراتی ہیں (جیسے مذہب بدلنے کی مطلق آزادی، یا جنسی آزادی)۔

اسلامی نقطہ نظر سے:

- کرامتِ انسانی: اسلام انسان کو "اشرف المخلوقات" سمجھتا ہے، اس لیے اسے وہ حقوق دیتا ہے جو اس کے شایانِ شان ہوں۔
- تضاد کا حل: جہاں عالمی چارٹر اور اسلامی شریعت میں تضاد ہو، وہاں مسلمان "شریعت" کو ترجیح دیں گے، کیونکہ اللہ کا قانون انسان کے بنائے ہوئے چارٹر سے زیادہ معتبر ہے۔

شوریٰ، مشارکت اور سیاسی ڈھانچہ (اسلامی پارلیمنٹ کا تصور)

ا۔ شوریٰ بطورِ اصلِ قرآنی

اسلامی نظامِ سیاست میں "شوریٰ" (Consultation) کا مقام وہی ہے جو جدید جمہوریت میں "پارلیمنٹ" کا ہے۔ قرآن کریم نے مومنین کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا: "وَ أَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ" "اور ان کے معاملات آپس کے مشورے سے طے پاتے ہیں۔"[1]

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا: "وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ" "اور (معاملاتِ حکومت) میں

[1] سورہ شوریٰ: ۳۸۔

ان سے مشورہ کیا کیجیے۔"[۱]

یہ آیات اس بات کی دلیل ہیں کہ اسلام میں "استبداد" (آمریت) کی کوئی گنجائش نہیں، بلکہ نظامِ حکومت "مشاورت" پر مبنی ہے۔

۲۔ شوریٰ کی فقہی حیثیت: مُعلِمہ یا مُلزمہ؟

کیا شوریٰ کا فیصلہ حکمران پر لازم ہے یا صرف مشورتی؟

- نظریہ اول (معلمہ): بعض علماء کا خیال ہے کہ شوریٰ صرف "معلمہ" (اطلاع دینے والی) ہے۔ حاکم مشورہ سننے کا پابند ہے، لیکن ماننے کا پابند نہیں۔ اگر وہ سمجھے کہ مشورہ غلط ہے، تو وہ اپنی رائے پر فیصلہ کر سکتا ہے۔ دلیل: "فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ" (جب آپ عزم کر لیں تو اللہ پر بھروسہ کریں)۔ یہاں عزم کی نسبت "واحد" (نبیؐ) کی طرف ہے، جمع کی طرف نہیں۔
- نظریہ دوم (ملزمہ): دوسرے علماء کا خیال ہے کہ شوریٰ کا فیصلہ حاکم پر "لازم" ہے۔ کیونکہ اگر مشورہ ماننا ہی نہیں تو پھر مشورہ لینے کا حکم کیوں دیا گیا؟ جنگِ احد میں رسول اللہ ﷺ نے اپنی رائے کے خلاف اکثریت کے مشورے پر عمل کیا تھا، جو اس بات کی دلیل ہے کہ شوریٰ ملزمہ ہے۔

جمہوریہ اسلامی ایران کا آئین "نظریہ دوم" (ملزمہ) کے قریب ہے، جہاں پارلیمنٹ کے قوانین حکومت پر لازم ہوتے ہیں (بشرطیکہ وہ شریعت کے خلاف نہ ہوں)۔

اسلامی پارلیمنٹ (مجلسِ شوریٰ) کا ڈھانچہ

اسلامی ریاست میں پارلیمنٹ کا کام "قانون سازی" نہیں (کیونکہ قانون ساز اللہ ہے)، بلکہ اس کا کام

---

[۱] سورہ آل عمران: ۱۵۹۔

"منصوبہ بندی اور تنفیذ" ہے۔

پارلیمنٹ (مجلس) یہ طے کرتی ہے کہ:

۱. شریعت کے قوانین کو آج کے دور میں کیسے نافذ کیا جائے؟

۲. بجٹ کیسے تقسیم ہو؟

۳. غیر ملکی معاہدے کیسے کیے جائیں؟

ان امور میں پارلیمنٹ کے ارکان (جو عوام کے نمائندے ہوتے ہیں) آزادانہ بحث کرتے ہیں اور اکثریت کی رائے سے فیصلہ کرتے ہیں۔ لیکن ان کے فیصلے کو "شورائے نگہبان" چیک کرتی ہے تاکہ وہ شریعت سے نہ ٹکرائے۔

بابِ ہشتم: شبہات کا ازالہ اور سوالات (اعتراضات کا تجزیہ)

استبداد اور ڈکٹیٹر شپ کا شبہ

۱۔ اشکال: کیا ولایتِ مطلقہ، آمریت ہے؟

عصرِ حاضر میں لبرل اور سیکولر حلقوں کی جانب سے سب سے بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ "ولایتِ فقیہ" دراصل "مذہبی آمریت" (Theocratic Dictatorship) کا دوسرا نام ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب ایک شخص کو "مطلق اختیار" دے دیا جائے اور اسے تاحیات رہبر بنا دیا جائے، تو یہ ڈکٹیٹر شپ نہیں تو اور کیا ہے؟

۲۔ امام خمینیؒ کا جواب: حکومتِ قانون

امام خمینیؒ نے اس شبہ کا دندان شکن جواب دیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اسلام میں حکومت "شخص" کی نہیں ہوتی، بلکہ "قانون" (اللہ کے حکم) کی ہوتی ہے۔

- خود کار معزولی: "اگر ولی فقیہ ایک لمحے کے لیے بھی استبداد (ڈکٹیٹر شپ) کرے، یا اپنی ذاتی خواہشات کی پیروی کرے، یا کسی کا حق مارے، تو وہ خود بخود ولایت کے منصب سے ساقط ہو جاتا ہے۔"

ڈکٹیٹر وہ ہوتا ہے جو قانون سے بالاتر ہو، جبکہ ولی فقیہ قانون (شریعت) کا سب سے زیادہ پابند ہوتا ہے۔ امامؒ فرماتے ہیں: "اسلام میں ڈکٹیٹر شپ نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ فقیہ تو ہے ہی اس لیے کہ وہ ڈکٹیٹروں کا راستہ روکے، نہ یہ کہ خود ڈکٹیٹر بن جائے۔"

۳۔ اختیارات کا فلسفہ

فقیہ کے پاس جو "مطلق اختیارات" ہیں، وہ اس کی ذات کے لیے نہیں، بلکہ "اجرائے احکام" کے لیے ہیں۔ جس طرح ایک سرجن ڈاکٹر کو پیٹ چاک کرنے کا "مطلق اختیار" ہوتا ہے تاکہ وہ مریض کی جان بچا سکے، اسی طرح فقیہ کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ مصلحتِ نظام کی خاطر سخت فیصلے کرے۔ یہ اختیار "ذاتی عیش" کے لیے نہیں، بلکہ "قومی ذمہ داری" کے لیے ہے۔

عصمت اور خطا کا شبہ

۱۔ اشکال: غیر معصوم کی مطلق اطاعت کیوں؟

ایک علمی شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ: "شیعہ عقیدے کے مطابق غیر مشروط اور مطلق اطاعت صرف معصوم (نبیؐ و امامؑ) کی ہو سکتی ہے کیونکہ وہ غلطی نہیں کرتے۔ ولی فقیہ معصوم نہیں ہے، اس سے غلطی ہو سکتی ہے، تو پھر اس کے حکم کی مطلق اطاعت کیوں واجب ہے؟ کیا یہ ہمیں غلط راستے پر نہیں لے جائے گا؟"

۲۔ جواب: ضرورتِ نظام اور عقلی رویہ

محققین نے اس کے بہت مضبوط جوابات دیے ہیں:

۱. عقلاء کا طریقہ: جب ہم بیمار ہوتے ہیں تو ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں اور اس کے نسخے پر آنکھ بند کر کے عمل کرتے ہیں، حالانکہ ڈاکٹر معصوم نہیں ہوتا اور اس سے غلطی ممکن ہے۔ لیکن عقل کہتی ہے کہ "احتمالِ غلطی" کے ڈر سے علاج ترک نہیں کیا جا سکتا، ورنہ موت یقینی ہے۔ اسی طرح معاشرتی نظام چلانے کے لیے "حاکم" کی اطاعت ضروری ہے، چاہے وہ غیر معصوم ہو۔

۲. اہون البلیتین (Lesser of two evils): اگر ہم کہیں کہ چونکہ فقیہ معصوم نہیں اس لیے

اطاعت نہیں کریں گے، تو نتیجہ کیا ہوگا؟ "ہرج و مرج" (Chaos) اور انارکی۔ انارکی کا نقصان، فقیہ کی اِکّا دُکّا غلطیوں کے نقصان سے ہزار درجہ زیادہ ہے۔

۳. مشاورتی نظام: ولی فقیہ اکیلے فیصلے نہیں کرتا، بلکہ ماہرین اور مشیروں کے مشورے سے فیصلے کرتا ہے، جس سے غلطی کا امکان کم ہوجاتا ہے۔

۴. قداستِ نظام: اگر ہر شخص کو یہ اجازت دے دی جائے کہ وہ "غلطی کے امکان" کا بہانہ بنا کر قانون توڑ دے، تو کوئی حکومت ایک دن بھی نہیں چل سکتی۔

تاریخی خاموشی کا شبہ

۱۔ اشکال: فقہاء نے پہلے کیوں نہیں لکھا؟

ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اگر ولایتِ فقیہ اتنا ہی اہم عقیدہ ہے تو شیخ طوسیؒ، علامہ حلیؒ اور دیگر قدیم فقہاء نے اپنی کتابوں میں اس پر الگ باب کیوں نہیں باندھا؟ کیا یہ امام خمینیؒ کی نئی ایجاد ہے؟

۲۔ جواب: سیاق و سباق

یہ اعتراض تاریخی حقائق سے لاعلمی کا نتیجہ ہے۔

۱. فقہی ابواب میں موجودگی: قدیم فقہاء نے "ولایتِ فقیہ" کے نام سے الگ کتاب نہیں لکھی، لیکن فقہ کے مختلف ابواب (جیسے جہاد، قضاوت، حدود، امر بالمعروف) میں یہ بحث چھیڑی ہے کہ "یہ کام سلطانِ عادل یا اس کے نائب (فقیہ) کا ہے۔" صاحبِ جواہرؒ، محقق کرکیؒ اور نراقی نے اس پر کھل کر لکھا ہے۔

۲. تقیہ اور سیاسی جبر: صدیوں تک شیعہ اقلیت میں رہے اور ظالم بادشاہوں کے زیرِ عتاب رہے۔

ایسے حالات میں "حکومت بنانے" کی بات کرنا موت کو دعوت دینا تھا۔ اس لیے فقہاء نے یہ بحثیں "اشاروں کنایوں" میں کیں یا اسے "علمِ کلام" (امامت) کے تحت بیان کیا۔

۳. ارتقاء: ہر علم وقت کے ساتھ پھیلتا ہے۔ جس طرح آج کی "بینکنگ" قدیم فقہ میں نہیں تھی لیکن اصول موجود تھے، اسی طرح حکومت کے تفصیلی ڈھانچے اب بنے ہیں، لیکن اس کی بنیاد (ولایت) ہمیشہ سے موجود تھی۔[۱]

اجماع اور اختلاف کا شبہ

۱۔ اشکال: علماء کا اختلاف

کہا جاتا ہے کہ "ولایتِ فقیہ پر علماء کا اجماع نہیں ہے، بہت سے علماء اس کے قائل نہیں، لہٰذا یہ قابلِ عمل نہیں۔"

۲۔ جواب: اختلاف کی نوعیت

اصلِ ولایت پر اتفاق: کوئی شیعہ فقیہ ایسا نہیں جو فقیہ کی ولایت کا سِرے سے انکار کرے۔ تمام فقہاء "امورِ حسبیہ" (ضروری معاشرتی امور) میں فقیہ کی ولایت کے قائل ہیں۔ اختلاف صرف "دائرہ کار" میں ہے۔ نظری مسائل میں اختلاف: دین کے بہت سے مسائل (جیسے نماز جمعہ کی شرائط) میں علماء کا اختلاف ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ نماز جمعہ ہی ختم کر دی جائے۔ اسی طرح حکومت ایک "ضرورت" ہے، جزوی اختلاف کی وجہ سے اسے ترک نہیں کیا جا سکتا۔ جب ایک فقیہ حکومت بنا لے، تو باقیوں پر بھی اس کی حمایت یا کم از کم عدمِ مخالفت واجب ہو جاتی ہے تاکہ نظامِ اسلام کمزور نہ ہو۔

---

[۱] چرا فقہا از ولی فقیہ نوشتہ اند؟، صفحہ ۳۲۶۸۔

جانِ سخن

ولایتِ فقیہ: طلوعِ خورشیدِ ولایت کا مقدمہ

"اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَرْغَبُ اِلَیْکَ فِیْ دَوْلَۃٍ کَرِیْمَۃٍ..." (اے اللہ! ہم تیری بارگاہ میں ایک ایسی باکرامت حکومت کے لیے رغبت کا اظہار کرتے ہیں جو اسلام اور اہل اسلام کو عزت دے اور نفاق اور اہل نفاق کو ذلیل کرے...)

ولایتِ فقیہ در حقیقت "امامت کا تسلسل" اور "انتظارِ مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف" کا عملی نمونہ ہے۔ یہ وہ نظام ہے جو مسلمانوں کو عزت، استقلال اور عدل فراہم کرتا ہے اور انہیں عالمی استکبار کے مقابلے میں سیسہ پلائی دیوار بناتا ہے۔ اگر "ولایتِ فقیہ" کے نظام کو "ظہورِ امام مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف" سے جدا کر کے دیکھا جائے تو یہ محض ایک خشک سیاسی ڈھانچہ رہ جاتا ہے۔ لیکن جب اسے ظہور کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ ایک "مقدس مشن" اور "تاریخی ذمہ داری" بن جاتا ہے۔

اس کتاب کے علمی سفر کے اختتام پر، ہم جس حتمی نتیجے پر پہنچتے ہیں وہ یہ ہے کہ "نظامِ ولایتِ فقیہ" کا قیام محض ایک ملک کو چلانے یا اقتدار حاصل کرنے کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ تاریخِ بشریت کے اس سب سے بڑے واقعے کی "تمہید" اور "زمینہ سازی" ہے جس کا وعدہ اللہ نے تمام انبیاء اور مرسلین سے کیا تھا— یعنی "ظہورِ منجئ عالمِ بشریت، حضرت ولی عصر (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف)"۔

اس عظیم تناظر میں ولایتِ فقیہ کے فلسفے کو درج ذیل چار بنیادی ستونوں پر سمجھا جاسکتا ہے:

۱۔ انتظار کا متحرک فلسفہ

صدیوں تک مسلمانوں (اور بالخصوص شیعوں) کو یہ باور کرایا گیا کہ "انتظار" کا مطلب ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنا اور ظلم سہنا ہے، یہاں تک کہ امامؑ آکر سب ٹھیک کر دیں۔ ولایتِ فقیہ کے نظریے نے اس "جامد" سوچ کو رد کیا اور "متحرک" انتظار کا تصور پیش کیا۔

- اگر آپ کسی معزز مہمان کے آنے کا انتظار کر رہے ہیں، تو کیا آپ گھر کو گندہ چھوڑ کر بیٹھ جائیں گے؟ نہیں! آپ گھر کی صفائی کریں گے اور انتظامات کریں گے۔
- تطبیق: بالکل اسی طرح، امامِ زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کی عالمی حکومت کے استقبال کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ایک "نمونہ حکومت" قائم کی جائے جو دنیا کو دکھا سکے کہ "عدلِ الٰہی" کیا ہوتا ہے؟ ولایتِ فقیہ کا نظام در حقیقت امام کی آمد کے لیے "رن وے" تیار کرنے کا نام ہے۔

۲۔ نیابت اور امانت داری

ولایتِ فقیہ کا نظام اس عقیدے پر استوار ہے کہ "حاکمیتِ اصلی" صرف امام معصوم علیہ السلام کی ہے۔ ولی فقیہ اس حکومت کا "مالک" نہیں، بلکہ "امین" ہے۔

- جب تک سورج (امامؑ) طلوع نہیں ہوتا، تب تک رات کے اندھیرے میں ستاروں (فقہاء) سے رہنمائی لینا عقل کا تقاضا ہے۔ ولی فقیہ وہ "چراغ" ہے جسے سورج کی غیر موجودگی میں جلایا گیا ہے تاکہ امت بھٹک نہ جائے۔
- ولی فقیہ کا سب سے بڑا ہدف یہ ہے کہ وہ اس امانت (حکومت) کی حفاظت کرے اور جب "صاحبِ امر" عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف تشریف لائیں تو یہ امانت اور پرچم ان کے سپرد کر دے۔ امام خمینیؒ نے

بار ہا فرمایا: "ہمیں امید ہے کہ یہ انقلاب امامِ زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے ظہورِ موفور السرور تک متّصل ہو جائے گا۔"

۳۔ مستضعفین بمقابلہ استکبار

قرآن کریم کا وعدہ ہے: "وَنُرِيدُ أَن نَّمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ" "اور ہم چاہتے ہیں کہ احسان کریں ان لوگوں پر جو زمین میں کمزور کر دیے گئے ہیں اور انہیں پیشوا بنائیں اور انہیں وارث بنائیں۔"

امام مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کی حکومت "مستضعفین" کی حکومت ہوگی۔ ولایتِ فقیہ کا نظام آج کی دنیا میں اسی عالمی جنگ کا آغاز ہے۔

- یہ نظام "عالمی استکبار" (Global Arrogance) کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑا ہے۔
- یہ مظلومینِ جہاں (چاہے وہ فلسطین میں ہوں یا افریقہ میں) کو یہ امید دلاتا ہے کہ "طاغوت" کو شکست دی جا سکتی ہے۔

لہٰذا، ولایتِ فقیہ صرف ایران کا اندرونی معاملہ نہیں، بلکہ یہ اس "عالمی مزاحمت" (Global Resistance) کا ہیڈکوارٹر ہے جو ظہور کے وقت دجالی طاقتوں کے خلاف امام عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے لشکر میں تبدیل ہوگی۔

۴۔ تشریعی اور تکوینی ربط

آخر میں، یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ولیِ فقیہ کی اطاعت دراصل امام عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کی اطاعت کی مشق ہے۔

- جو قوم ایک "غیر معصوم نائب" (ولی فقیہ) کے حکم پر اپنی جان، مال اور اولاد قربان کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتی، وہ ایک "معصوم امام" کے عالمی مشن کا بوجھ کیسے اٹھائے گی؟

- ولایتِ فقیہ امت کی تربیت گاہ ہے، جہاں انہیں نظم و ضبط، اطاعت، اور ایثار سکھایا جاتا ہے، تاکہ جب "یومِ موعود" آئے تو امام عجل اللہ فرجہ کو "کوفیوں" جیسی بے وفائی کا سامنا نہ کرنا پڑے، بلکہ انہیں ایسے "آہنی عزم والے سپاہی" ملیں جو اشارے پر پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دیں۔

عصرِ غیبت میں نظامِ ولایت کی آفاقی اور اسٹریٹجک جہتیں

دجالی نظام بمقابلہ ولایتِ الٰہی

عصرِ حاضر کی جیو پلیٹکس (Geo-politics) کو اگر دینی نگاہ سے دیکھا جائے تو دنیا میں اس وقت دو نظاموں کا ٹکراؤ اپنے عروج پر ہے:

۱. نظامِ سلطہ (System of Hegemony): جسے روایات میں "دجالی نظام" یا "سفیانی خدوخال" کہا جا سکتا ہے۔ اس کی بنیاد مادہ پرستی، فحاشی، سود، اور کمزوروں کے استحصال پر ہے۔ مغربی لبرل ڈیموکریسی اور صیہونیت اس کا مظہر ہیں۔

۲. نظامِ ولایت: اس کی بنیاد توحید، عدل، اور معنویت پر ہے۔

ولایتِ فقیہ کا کردار:

ولایتِ فقیہ محض ایک ملک (ایران) کی حکمرانی نہیں ہے، بلکہ یہ اس "عالمی دجالی نظام" کے خلاف واحد "مورچہ" ہے۔

- اگر ولایتِ فقیہ نہ ہوتی، تو دنیا "نیو ورلڈ آرڈر" (New World Order) کے نام پر مکمل

طور پر شیطانی اقدار کی غلام بن چکی ہوتی۔

- یہ ولایتِ فقیہ ہی ہے جس نے "نہ مشرق، نہ مغرب" کا نعرہ لگا کر انسانیت کو تیسرا راستہ دکھایا۔ لہٰذا، اس نظام کی حفاظت در حقیقت "انسانیت کی آخری امید" کی حفاظت ہے۔

"تمحیص" اور خالص سازی

ولایتِ فقیہ کا دور دراصل "تمحیص" (چھانٹی/Purification) کا دور ہے۔ اللہ تعالیٰ ظہور سے پہلے مومنین کو سخت امتحانات سے گزار رہا ہے تاکہ "کھرے اور کھوٹے" الگ ہو جائیں۔

- نظریاتی نفاق کا خاتمہ: ولایتِ فقیہ ایک "کسوٹی" ہے۔ جو لوگ زبان سے امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کا نام لیتے ہیں لیکن عمل میں "امریکہ" یا "دنیا" سے ڈرتے ہیں، ولایتِ فقیہ کا نظام ان کے نفاق کو ظاہر کر دیتا ہے۔
- تربیتِ سپاہ: امام مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کو ۳۱۳ خاص کمانڈرز اور ہزاروں مخلص سپاہی چاہیے۔ یہ سپاہی آسمان سے نہیں اتریں گے، بلکہ اسی "نظامِ ولایت" کی گود میں پل کر جوان ہوں گے۔ جو آج ولی فقیہ کے حکم پر اپنی خواہشات قربان نہیں کر سکتا، وہ کل امام عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے حکم پر جان کیسے دے گا؟

"اعداد" (تیاری) کا فقہی و عسکری مفہوم

قرآن کا حکم ہے: "وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ" "اور دشمن کے مقابلے کے لیے جس قدر طاقت میسر ہو تیار رکھو۔"

زمانہ قدیم میں انتظار کا مطلب صرف "دعا" سمجھا جاتا تھا۔ ولایتِ فقیہ نے اسے "اعداد"

(تیاری/Preparation) میں بدل دیا۔

۱. علمی تیاری: جدید ٹیکنالوجی، سائنس اور خلائی میدان میں ترقی (کیونکہ امام عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کی حکومت علم کی حکومت ہوگی)۔

۲. عسکری تیاری: میزائل، ڈرون اور دفاعی صلاحیت۔ (تاکہ جب امام عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف آئیں تو ان کے پاس ایک طاقتور بیس کیمپ موجود ہو)۔

۳. سیاسی تیاری: خطے میں مزاحمتی بلاک (Resistance Axis) کا قیام، تاکہ مستضعفین کے پاس ایک "سیاسی چھتری" موجود ہو۔

اس تمام گفتگو سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ "ولایتِ فقیہ" محض ایک فقہی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ یہ "اسرارِ آلِ محمدؐ" میں سے ایک راز ہے۔

یہ وہ نظام ہے جو انسان کو "خود پرستی" کی قید سے نکال کر "خدا پرستی" کی معراج تک لے جاتا ہے، اور معاشرے کو "جنگل کے قانون" سے پاک کرکے "مدینہ فاضلہ" (Ideal Society) کا نمونہ بناتا ہے۔

جو شخص آج اس نظام کی حفاظت کر رہا ہے، وہ درحقیقت "خیمۂ امامِ زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف" کی حفاظت کر رہا ہے۔

پس اے عزیز قارئین!

یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں محض سیاسیات کا نصاب نہیں، بلکہ "عصرِ ظہور" کا دعوت نامہ ہے۔

نظامِ ولایتِ فقیہ وہ "کشتیِ نجات" ہے جو غیبت کے طوفانوں میں امت کو ساحلِ ظہور تک لے جانے کی ضامن ہے۔ اس نظام کی حفاظت، اس کی تقویت، اور اس کی اطاعت دراصل اس دعا کا عملی ثبوت ہے جو

ہم ہر صبح پڑھتے ہیں:

"عَجِّلْ عَلٰی ظُهُورِکَ یَا صَاحِبَ الزَّمَان"

مناجات و نذرانۂ عقیدت

بِسْمِ اللَّهِ نُورِ النُّورِ

السَّلَامُ عَلَیْکَ یَا بَقِیَّةَ اللَّهِ فِی أَرْضِهِ.. السَّلَامُ عَلَیْکَ یَا وَعْدَ اللَّهِ الَّذِی ضَمِنَهُ..

اے وارثِ انبیاء! اے امیدِ اولیاء! اے کعبۂ مقصود! اور اے یوسفِ زہرا (سلام اللہ علیہا)!

یہ اوراق جو ابھی مکمل ہوئے، یہ روشنائی جو قرطاس پر بکھری، اور یہ الفاظ جو ترتیب پائے... یہ محض ایک کتاب نہیں، بلکہ ہمارے تڑپتے ہوئے دلوں کی وہ صدا ہے جو صدیوں سے آپ عجل اللہ تعالی فرجہ الشریف کی راہ تک رہی ہے۔

مولا جان!

ہم نے یہ کتاب "نظامِ ولایتِ فقیہ" اس لیے مرتب کی ہے کہ ہم غیبت کے اس پرآشوب دور میں، جہاں فتنے اندھیری رات کے ٹکڑوں کی طرح برس رہے ہیں، "چراغِ ولایت" کو بجھنے سے بچا سکیں۔ ہم نے آپ کے نائب (ولی فقیہ) کی اطاعت کا طوق اپنی گردن میں اس لیے ڈالا ہے تاکہ ہم "اطاعت کی مشق" کر سکیں، اور جب آپ تشریف لائیں تو ہمیں "سرِ تسلیم خم کرنے" میں کوئی دشواری نہ ہو۔

اے صاحبِ عصر!

ہم یوسفِ مصر کے خریداروں کی صف میں کھڑی اس بڑھیا کی مانند ہیں جو اپنی "سُوت کی انٹی" (حقیر

پونجی) لے کر آئی تھی، تاکہ خریداروں کی فہرست میں اپنا نام لکھوا سکے۔ ہماری یہ علمی کاوش بھی اس "سُوت کی انٹی" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ اسے اپنی کریمی سے قبول فرما لیجیے اور ہمارا نام اپنے "ناصرین اور منتظرین" کے رجسٹر میں درج فرما لیجیے۔

اے منتقمِ خونِ حسین علیہ السلام!

گواہ رہنا! ہم نے طاغوت کا انکار کیا ہے۔ ہم نے استکبار کے بتوں کو توڑا ہے۔ ہم نے آپ کی غیبت میں "خیمۂ ولایت" کو تنہا نہیں چھوڑا۔ ہمارے شہداء کے لہو، ہمارے علماء کی سیاہی، اور ہمارے جوانوں کے عزم نے اس پرچم کو تھام رکھا ہے جو اب آپ کے ہاتھوں میں جانے کے لیے بے قرار ہے۔

بارالٰہا!

اس نظامِ مقدس کی حفاظت فرما۔ ہمارے رہبرِ معظم کی عمر دراز فرما۔ امتِ مسلمہ کو ولایت کے سائے میں متحد فرما۔ اور ہمیں وہ توفیق عطا کر کہ جب "ندائے آسمانی" گونجے، تو ہم اپنی قبروں سے کفن پھاڑ کر، تلواریں نیام سے نکال کر، لبیک کہتے ہوئے اپنے آقا کے حضور حاضر ہو جائیں۔

اَیْنَ الطَّالِبُ بِذُحُولِ الْاَنْبِیاءِ وَ اَبْناءِ الْاَنْبِیاءِ؟ "کہاں ہے وہ ہستی جو انبیاء اور فرزندانِ انبیاء کے خون کا انتقام لے گی؟"

اَیْنَ مُعِزُّ الْاَوْلِیاءِ وَ مُذِلُّ الْاَعْداءِ؟ "کہاں ہے وہ ہستی جو دوستوں کو عزت اور دشمنوں کو ذلت دے گی؟" اے خدا! ہماری ان ویران آنکھوں کو اس جمالِ جہاں آرا کی زیارت سے منور فرما دے...

اَلْعَجَلَ، اَلْعَجَلَ، یَا مَوْلَایَ یَا صَاحِبَ الزَّمَانِ

وَ آخِرُ دَعْوانا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعالَمِینَ

منابع و مآخذ

قرآن مجید

نہج البلاغہ

۱. ابن بابویہ، محمد بن علی؛ الأمالی للشیخ الصدوق، قم، بنیاد بعثت، ۱۴۱۷ھ۔

۲. ابن بابویہ، محمد بن علی؛ علل الشرائع، بیروت، دار المرتضی، ۱۴۲۷ھ۔

۳. ابن بابویہ، محمد بن علی؛ من لا یحضرہ الفقیہ، بیروت، دار الأضواء، ۱۴۰۵ھ۔

۴. ابن شہر آشوب، محمد بن علی؛ مناقب آل أبی طالب، نجف، مکتبۃ الحیدریہ، ۱۳۷۶ھ۔

۵. ابن منظور، محمد بن مکرم؛ لسان العرب، بیروت، دار صادر، ۱۴۱۴ھ۔

۶. ابن حیون، نعمان بن محمد؛ دعائم الاسلام، قم، مؤسسۃ آل البیت، ۱۳۸۵ھ۔

۷. ابن فہد حلی، احمد بن محمد؛ عدۃ الداعی و نجاح الساعی، قم، دار الکتاب الاسلامی، ۱۴۰۷ھ۔

۸. آصفی، محمد مھدی؛ المبانی الفقہیۃ للمقاومۃ، نجف، مجمع عالمی اہل بیتؑ، ۱۴۳۲ھ۔

۹. آذری قمی، احمد؛ ولایت فقیہ از دیدگاہ فقہای اسلام، قم، دار العلم، ۱۹۹۳ء۔

۱۰. آلوسی، محمود بن عبداللہ؛ روح المعانی، بیروت، دار احیاء التراث العربی، ۱۴۲۱ھ۔

۱۱. بیہقی، احمد بن حسین؛ دلائل النبوۃ، بیروت، دار الکتب العلمیۃ، ۱۴۰۵ھ۔

۱۲. پیشہ فرد، مصطفیٰ؛ پیشینہ نظریہ ولایت فقیہ، تہران، خبرگان رھبری، ۱۳۸۰ش۔

۱۳. پیروز مند، علیرضا؛ نظام معقول تحلیل مبنایی نظام ولایت فقیہ، تہران، کیہان، ۱۳۷۸ش۔

۱۴. توسلی، محمد حسین؛ دین؛ دریای سیاست، قم، مرکز پژوھش ھای اسلامی، ۱۳۸۱ش۔

۱۵. جعفریان، رسول؛ حیات فکری سیاسی امامان شیعہ، قم، انصاریان، ۱۳۸۷ش۔

۱۶. جلالی زادہ، جلال؛ مبادی و اصطلاحات اصول فقہ، تہران، احسان، ۱۳۸۷ش۔

۱۷. جوادی آملی، عبداللہ؛ ولایت فقیہ، قم، مرکز نشر اسراء، ۱۳۷۸ش۔

۱۸. حرعاملی، محمد بن حسن؛ وسائل الشیعہ، قم، مؤسسۃ آل البیت، ۱۴۰۹ھ۔
۱۹. حلبی، ابوصلاح؛ الکافی فی الفقہ، اصفہان، مکتبہ امام امیر المؤمنینؑ، ۱۴۰۳ھ۔
۲۰. خمینی، روح اللہ؛ تحریر الوسیلہ، تہران، مؤسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی، ۱۴۳۴ھ۔
۲۱. خمینی، روح اللہ؛ صحیفہ امام خمینی، تہران، مؤسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی، ۱۳۸۹ش۔
۲۲. خمینی، روح اللہ؛ سرّ الصلاۃ، تہران، مؤسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی، ۱۳۸۸ش۔
۲۳. خمینی، روح اللہ؛ ولایت فقیہ، تہران، مؤسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی، ۱۳۷۳ش۔
۲۴. دھشیری، محمد رضا؛ جایگاہ تکافل و رفتار ھای حمایتگرانہ در دیپلماسی فرھنگی، تہران، الہدی، ۱۳۹۲ش۔
۲۵. رضایی اصفہانی، محمد علی؛ قرآن و تربیت، قم، مرکز تحقیقات قرآن کریم، ۱۳۹۷ش۔
۲٦. سبحانی تبریزی، جعفر؛ اندیشہ اسلامی، قم، دفتر نشر معارف، ۱۳۹۱ش۔
۲۷. سبحانی تبریزی، جعفر؛ موسوعۃ طبقات الفقہاء، قم، مؤسسہ امام صادقؑ، ۱۴۱۸ھ۔
۲۸. شاکرین، حمید رضا؛ ولایت فقیہ و جمہوری اسلامی ایران، قم، دفتر نشر معارف، ۱۳۹۰ش۔
۲۹. شمس الدین، محمد مہدی؛ نظام الحکم و الإدارۃ فی الإسلام، ۱۴۱۱ھ۔
۳۰. شیخ طوسی، محمد بن حسن؛ النہایۃ فی مجرد الفقہ و الفتاوی، بیروت، دار الکتاب العربی، ۱۴۰۰ھ۔
۳۱. شیخ مفید، محمد بن محمد؛ المقنعہ، قم، مؤسسہ نشر اسلامی، ۱۴۱۰ھ۔
۳۲. شیخ صدوق؛ کمال الدین و تمام النعمۃ، قم، مؤسسۃ النشر الاسلامی، ۱۴۰۵ھ۔
۳۳. طباطبائی، سید محمد حسین؛ المیزان فی تفسیر القرآن، قم، دفتر انتشارات اسلامی، ۱۴۱۷ھ۔
۳۴. طریحی، فخر الدین؛ مجمع البحرین، بیروت، دار الھلال، ۱۹۸۵ء۔
۳۵. عاملی، جعفر مرتضیٰ؛ الصحیح من سیرۃ النبی، قم، دار الحدیث، ۱۴۲٦ھ۔
۳٦. علامہ حلی، حسن بن یوسف؛ تذکرۃ الفقہاء، قم، مؤسسۃ آل البیت، ۱۴۱۹ھ۔
۳۷. فوزی تویسرکانی، یحییٰ؛ اندیشہ سیاسی امام خمینی، قم، دفتر نشر معارف، ۱۳۹۰ش۔
۳۸. کدیور، محسن؛ نظریہ ھای دولت در فقہ شیعہ، تہران، نشر نی، ۱۳۷٦ش۔
۳۹. کریمی، جعفر؛ ولایت فقیہ، تہران، سپاہ پاسداران، ۱۳۷۸ش۔
۴۰. کلینی، محمد بن یعقوب؛ الکافی، تہران، دار الکتب الاسلامیہ، ۱۴۰۷ھ۔

۴۱. لطیفی، رحیم؛ مھدویت، حکومت دینی و دموکراسی، قم، بنیاد فرھنگی حضرت مھدیؑ، ۱۳۹۵ش۔
۴۲. مجلسی، محمد باقر؛ بحار الأنوار، بیروت، مؤسسۃ الوفاء، ۱۴۰۳ھ۔
۴۳. محامد، علی؛ أسس الحکومۃ الدینیۃ، قم، انتشارات زائر، ۱۳۹۰ش۔
۴۴. مرادی، علی اصغر؛ واژہ نامہ فقہ سیاسی، قم، مرکز فقھی ائمہ اطھارؑ، ۱۳۸۹ش۔
۴۵. مرندی، محمد رضا؛ مجموعہ مقالات مردم سالاری دینی، قم، دفتر نشر معارف، ۱۳۸۸ش۔
۴۶. مطھری، مرتضیٰ؛ یادداشت ھای استاد مطھری، تھران، صدرا، ۱۳۷۸ش۔
۴۷. معرفت، محمد ہادی؛ ولایت فقیہ، قم، مؤسسہ التمھید، ۱۳۷۷ش۔
۴۸. مکارم شیرازی، ناصر؛ تفسیر نمونہ، تھران، دار الکتب الاسلامیہ، ۱۳۷۴ش۔
۴۹. مکارم شیرازی، ناصر؛ شیعہ و علوم اسلامی، قم، انتشارات امام علیؑ، ۱۳۹۷ش۔
۵۰. مکارم شیرازی، ناصر؛ نقش شیعہ در گسترش علوم اسلامی در شبہ قارہ، قم، انتشارات امام علیؑ، ۱۳۹۷ش۔
۵۱. مظفر، محمد حسین؛ تاریخ الشیعہ، بیروت، دار الزہراء، ۱۴۰۸ھ۔
۵۲. مغنیہ، محمد جواد؛ الشیعہ فی المیزان، بیروت، دار الجواد، ۱۴۱۷ھ۔
۵۳. نجفی، محمد حسن؛ جواہر الکلام، بیروت، دار احیاء التراث العربی، ۱۳۶۲ش۔
۵۴. نصرتی، علی اصغر؛ نظام سیاسی اسلام، قم، مرکز نشر ہاجر، ۱۳۸۳ش۔
۵۵. نمازی، عبد النبی؛ آشنایی با مجلس خبرگان، تھران، منھاج، ۱۳۸۵ش۔
۵۶. نقوی، علی نقی؛ تراجم مشاہیر علماء الہند، کربلا، العتبہ العباسیہ، ۱۴۳۵ھ۔
۵۷. ہمایش بین المللی میراث مشترک ایران و ہند؛ مجموعہ مقالات ہند شناخت، قم، مجمع ذخائر اسلامی، ۱۳۹۲ش۔

مقالات

۱. اشراقی، حمید رضا؛ «فلسفہ و اھداف حکومت اسلامی» (اسلامی حکومت کا فلسفہ اور اہداف)، رواق اندیشہ، شمارہ ۴۵، شہریور ۱۳۸۴ش، ص ۹۲–۱۱۳۔
۲. اخوان کاظمی، بہرام؛ «آرمان ھای حکومت از دیدگاہ امام علی (ع)» (امام علیؑ کے نقطۂ نظر سے حکومت کے

مقاصد)، حکومت اسلامی، شمارہ ۱۷، ۱۳۷۹ش، ص ۱۳۰–۱۴۴۔

۳. حقیقت، سید صادق؛ «گونہ شناسی ارتباط دین و سیاست در اندیشہ سیاسی شیعہ» (شیعہ سیاسی فکر میں دین و سیاست کے تعلق کی اقسام)، نامہ مفید، شمارہ ۴۴، مہر و آبان ۱۳۸۳ش، ص ۴–۳۲۔

۴. قوامی، سید صمصام الدین؛ «روش حکومتی پیامبر (ص)» (پیغمبر اکرمؐ کا طرزِ حکومت)، حکومت اسلامی، شمارہ ۹، پاییز ۱۳۷۷ش، ص ۱۶–۴۰۔

۵. لک زائی، شریف؛ «چیستی ولایت مطلقہ فقیہ در اندیشہ سیاسی امام خمینی (رہ)» (امام خمینیؒ کی سیاسی فکر میں ولایتِ مطلقہ فقیہ کی حقیقت)، مطالعات انقلاب اسلامی، شمارہ ۲، پاییز ۱۳۸۴ش، ص ۱۱–۲۸۔

۶. مصباح یزدی، محمد تقی؛ «اختیارات ولی فقیہ در خارج از مرزھا» (ولی فقیہ کے اختیارات بین الاقوامی حدود میں)، حکومت اسلامی، شمارہ ۱، پاییز ۱۳۷۵ش، ص ۸۱–۹۵۔

۷. ورعی، سید جواد؛ «ماھیت حکومت اسلامی» (اسلامی حکومت کی ماہیت)، حکومت اسلامی، شمارہ ۳۱، بہار ۱۳۸۳ش، ص ۶۱–۸۱۔

جب تک سورج بادلوں کی اوٹ
میں ہے، ہمیں چراغوں کی حفاظت کرنی ہوگی۔
نظامِ ولایتِ فقیہ وہی چراغ ہے جو عصر غیبت کی
تاریکیوں میں امت کو راستہ دکھاتا ہے۔یہ کتاب "نظامِ
ولایتِ فقیہ: عصر غیبت سے عصرِ ظہور تک" ایک علمی کاوش سے
بڑھ کر ایک مشن ہے۔ یہ کتاب ثابت کرتی ہے کہ ایک عادل فقیہ کی
اطاعت دراصل امامِ وقت کی اطاعت کی تمرین ہے۔ آئیے اس نظام
کو سمجھیں، تاکہ جب "وارثِ زمین" تشریف لائیں تو ہم آپ کے لشکر
کی صفِ اول میں کھڑے ہونے کے اہل ہوسکیں۔

